

دوسرا رنگ

وصیت

کاشف زبیر

اُس وصیت نامے کی کہانی جس پر عمل درآمد کا وقت قریب آ گیا تھا

وراثت میں ملنے والی دولت و جائیداد کے ساتھ کچھ مسائل بھی وارث کے حصے میں آتے ہیں اور ان سے نمٹنا اس کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ وہ نوجوان وکیل بھی ایک ایسے ہی مسئلے میں خود کو الجھا بیٹھا تھا۔ ایک وصیت نامہ اُسے شہرِ اجل تک لے آیا تھا جہاں دولت کے بھوکے بھیڑیے اُس کی ٹاک میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے منصوبوں سے بے خبر ایک پیکرِ حسن و جمال کی زلفِ گدہ گدہ کا اسیر ہو گیا اور ایسا ہی حال میں پھنس گیا جس سے نکلنے کا کوئی راستہ اُسے معلوم نہ تھا۔

نیشل ہائی وے سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ مگر سائپ کی طرح بل کھاتے راستوں اور گہری کھائیوں کی وجہ سے یہ فاصلہ تقریباً ستر کلومیٹر بن جاتا تھا۔ پھر یہاں گاڑی بھی خاصی دیکھ بھال کر چلائی پڑتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف قابل دید مناظر تھے۔ ہر طرف سرسبز زمین تھی جس پر رنگا رنگ پھول اور جنگلی پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ جگہ جگہ دودھیا رنگت والی بھیڑیں چر رہی تھیں اور ان کے پیچھے بھاگتی پہاڑی دو شیرازیں خود بھی ہرناں لگ رہی تھیں۔

میں تھوڑی دیر پہلے والے حادثے کو بھول کر ان خوش رنگ مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک سڑک کی دائیں طرف ایک اطلاعی بورڈ نظر آیا جس پر مرمت کی غرض سے سڑک بند ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ بورڈ پر تیر کی مدد سے دائیں طرف ایک کچے راستے کی طرف اشارہ تھا۔ یہ متبادل راستہ تھا۔ میں نے کار اس پر ڈال دی۔ یہ خاصا تنگ راستہ تھا مگر آگے جا کر اتنا تنگ ہو گیا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے کار راستے سے اتر جاتی اور پھر اسے دوبارہ راستے پر لانا محال ہو جاتا چنانچہ میں اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کیے ہوئے تھا اور جب میری نظر تیزی سے نزدیک آنے والا پر پڑی تو فاصلہ بمشکل بیس فٹ رہ گیا تھا۔ اگرچہ کار کی رفتار دس میل فی گھنٹہ کے قریب تھی مگر جب پورے بریک لگانے کے بعد گاڑی رکی تو تقریباً عمودی خلا اس کے اگلے ٹائروں سے محض فٹ بھر دور تھا۔ دہشت سے میرے دو ٹکٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ پچھلے دو ٹکٹے میں یہ دوسرا موقع تھا جب میں اپنے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔

اس دوسرے حادثے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا یہ محض اتفاقات تھے مگر راستے کی نشان دہی کرنے والا بورڈ بہر حال میرا وہم نہیں تھا۔ تقریباً چوتھائی میل گاڑی کو پورس گیر میں چلا کہ جب میں سڑک پر واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر دم بہ خود ہو گیا کہ وہاں

مگر بڑا کا احساس ہوتے ہی میرا پاؤں بے اختیار بریک پر جا لگا۔ کار برقی طرح لہرائی، گھومی اور ایک چکر کھا کر رُک گئی۔ کار تو رُک گئی تھی مگر اس کا پچھلا ایک وہیل بدستور دوڑ رہا تھا۔ وہ گاڑی سے نکل گیا تھا۔ آخر کار وہ ایک کھائی میں جا گرا۔ اگر میں بروقت بریک نہ لگاتا تو شاید اس وہیل کی طرح کھائی میں لڑھک چکا ہوتا۔

”میاں ساجد ملک، خدا کا شکر ادا کرو۔“ میں نے گویا خود سے کہا اور کار سے اُتر گیا۔

نور گڑھ ہائی وے نامی یہ سڑک بمشکل دس بارہ فٹ چوڑی تھی اور کہیں سے بھی ایک ہائی وے نظر نہیں آتی تھی۔ نیشل ہائی وے اور نور گڑھ نامی چھوٹے سے شہر کو ملانے والی اس سڑک پر سفر کا یہ میرا محض پہلا گھنٹا تھا جب میری کار کا وہیل نکل گیا۔ اگرچہ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی مگر ابھی بمشکل ایک گھنٹہ پہلے نیشل ہائی وے کے ایک سروس اسٹیشن سے میں نے کار کو چیک کرایا تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں پتوں کے ٹس وغیرہ کی چیکنگ بھی شامل تھی۔ اب یہ غلطی تھی یا اتفاق مگر میں ایک مسلک حادثے سے بال بال بچا تھا۔ میں نے باقی پتوں کے ٹس چیک کیے جو مضبوطی سے اپنی جگہ جھے ہوئے تھے۔

پھر کیا وجہ تھی کہ ایک وہیل کے ٹس ڈھیلے ہو گئے تھے جبکہ میں صاف ستھری ہموار سڑک پر سفر کرتا آیا تھا۔ بہر حال میں نے اسپر وہیل نکالا اور گاڑی جیک پر چڑھا دی۔ خوش قسمتی سے ٹول بکس میں فالتو ٹس موجود تھے۔ وہیل چڑھا کر میں آگے روانہ ہو گیا۔

نور گڑھ، دارالحکومت سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر شمال مغرب میں واقع ایک خوب صورت اور پُر فضا مقام پر آباد اوسط درجے کا شہر تھا۔ اس کے جنوب میں دور تک زرعی زمینیں تھیں جبکہ اس کے شمال میں کھنے جنگلات سے ڈھکے بلند وبالا پہاڑ تھے۔ نور گڑھ

وقت آیا جب وہ کھڑکی سے سر نکال کر غرائی ”تم پاگل ہو یا بہرے“ اتنی دیر سے راستہ روکے کھڑے ہو۔“

اس آفتابِ حسن کی کرنوں نے مجھے مدھوش سا کر دیا تھا۔ ابھی میں کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے دانت پیس کر گاڑی دوڑا دی۔ میں نے بمشکل چھلانگ لگا کر خود کو بچایا۔ جب تک میں اٹھ کر کپڑے جھاڑتا، سرخ کنور نیبل غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا بغور جائزہ لیا مگر سب اعضا ٹھیک ٹھاک تھے سوائے دل کے جو زندگی میں پہلی بار میرے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی ایسے تباہ کن حسن و خوب صورتی کی مالک تھی جو پہلے کبھی میری نظر میں نہیں آیا تھا۔

اس لڑکی کو دیکھنے سے پہلے میں واپسی کا تقریباً نوے فی صد فیصلہ کر چکا تھا مگر اب یہ فیصلہ ڈانواں ڈول ہو چکا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ اس علاقے میں کچھ نادر ”مہربان“ موجود تھے جو مجھے اس

لگا بورڈ اور سڑک بلاک کرنے والے پتھرائے عناق ہو گئے تھے جیسے سرکاری ملازمین میں احساسِ ذمے داری غائب ہو گیا ہے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کچھ لوگوں کے لیے اس دنیا میں یا کم از کم اس علاقے میں میرا وجود ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اس دنیا سے انتقال کر جاؤں ورنہ ظاہر ہے کہ اطلاعی بورڈ اور پتھر نہ تو خود بخود یہاں آسکتے تھے اور نہ ہی یہاں سے جاسکتے تھے۔ میں نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر کے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا۔ میں عادی اسموکر نہیں ہوں مگر ٹینشن میں سگریٹ کی طلب محسوس ہو جاتی ہے۔

میں احمقوں کی طرح ویران سڑک پر نظریں جمائے کھڑا تھا کہ ہارن نے مجھے اُچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں بوکھلا کر مڑا۔ ایک سرخ کنور نیبل کار مجھ سے کچھ ہی دور موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہستی کو دیکھ کر میں تقریباً انگشت بندناں رہ گیا۔ ہوش اس



دنیا کی مصیبتوں سے نجات دلانے کی کوششیں کر چکے تھے۔ امکان تھا کہ وہ مستقبل قریب میں بھی ایسی کوششوں سے باز نہیں آئیں گے مگر میرا جذبہ تجسس مجھے مجبور کر رہا تھا کہ آگے بڑھوں اور اس راز سے پردہ اٹھاؤں۔ اب جذبہ تجسس کے علاوہ جذبہ عشق بھی مجھے متعدی مرض کی طرح لاحق ہو چکا تھا اور اس کا سبب وہ حسینہ تھی جو میرے تصوراتی آئیڈیل سے دو سو فی صد ملتی تھی۔

اگرچہ عشق کرنے کے لیے میرا زندہ رہنا ایک لازمی امر تھا اور میری جان کو خطرہ بھی لاحق تھا۔ مگر زندگی میں پہلی بار میں نے اپنی عقل کی وارننگ نظر انداز کر کے دل کی پکار سننے کو ترجیح دی۔ چنانچہ جب میں نے کار دوبارہ اشارت کی تو میرا رخ نور گڑھ کی طرف ہی تھا۔



مجھے پورا یقین ہے کہ میری کم بختی کا آغاز اسی دن ہو گیا تھا جب میں نے والد صاحب کے درمیان اور شدید مطالبے کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا۔ وہ ایک نامور وکیل تھے اور ان کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ان کی اولاد میں سے کوئی ایک ان کی سیٹ بھی سنبھالے بلکہ صحیح لفظوں میں ان کے مقدمات سنبھالے۔ وہ دیوانی وکیل تھے اور ان کے بعض کیس تو ان کی شادی سے بھی پہلے سے چلے آ رہے تھے اور ان کی زندگی میں بھی ان کیسوں کا فیصلہ ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ کم از کم ایک فرد تو ہو جو ان کے بعد ان کیسوں کو اپنا ذریعہ روزگار بنائے۔ بقول ابا جان کے کہ یہ کیس بیکر پالیسی سے بھی زیادہ محفوظ ذریعہ آمدنی تھے۔

ابا جان نے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں کا آغاز بڑے بھائی صاحب سے کیا مگر وہ جر طزم میں ایم اے کر کے صحافت کو پیارے ہو گئے۔ ان سے مایوس ہو کر ابا جان نے اپنی امیدیں بھائی صاحب سے وابستہ کر لیں۔ مگر وہ بڑے بھیا سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ پہلے انہوں نے ایک گرین کارڈ ہولڈر لڑکی سے شادی کر لی جس میں سوائے گرین کارڈ کے اور کوئی خوبی نہ تھی پھر وہ امریکا سدھار گئے۔ اگلا نمبر بڑی آیا کا تھا۔ اگرچہ ان کا ارادہ ہوم آکٹاکس میں بی اے کرنے کا تھا مگر ابا جان کے خطرناک ارادوں سے گھبرا کر انہوں نے بیاہ کو ترجیح دی اور خوشی خوشی اپنے شوہر کی پناہ میں چلی گئیں۔ اب وہ بغیر ہوم آکٹاکس پڑھے اپنا گھر اور اپنے چار آفت کے پر کالے بچوں کو بڑی خوبی سے سنبھال رہی ہیں۔ ان کے بعد چھوٹی آپا تھیں جنہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر رکھا تھا کہ وہ سوائے میڈیکل کے کچھ اور ہرگز ہرگز نہیں پڑھیں گی۔ کچھ وہ ارادے کی مضبوط تھیں اور پھر امی جان کی بھی جیتی تھیں۔ امی کے سامنے ابا کے تمام دلائل بے کار ہو جاتے تھے۔ چھوٹی آپا ان دنوں اپنا ہاؤس جاب مکمل کر رہی تھیں۔

بد قسمتی سے آخری اولاد میں تھا اور ظاہر ہے کہ ابا جان کی آخری امید بھی۔ پھر امی بھی مجھ سے خاصی تالاں رہتی تھیں۔ ان

ابا جان کا دفتر ایک معروف کاروباری علاقے میں ایک کثیر المنزلہ عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ وہ اپنے دفتر میں آنے والے کسی مؤکل کو مایوس لوٹا ناگناہ سمجھتے تھے۔ چاہے اسے یہ خدشہ ہی کیوں نہ ہو کہ پہلی پیشی پر اس کے خلاف فیصلہ سنایا جائے گا۔ خاص طور پر بھاری جیبوں والے مؤکلوں کو ہاتھ سے جانے دینا وہ گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ ان کے پاس مقدموں کی بھرمار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دفتر کا عملہ چھ افراد پر مشتمل تھا۔ جن میں تین جو نیئر وکیل، ایک ٹائپسٹ، ابا جان کی سیکریٹری مس شیخ اور ایک چہر اسی شامل تھا۔

جو نیئر وکیل تقریباً ہر سال دوسرے آجایا کرتے تھے۔ ٹائپسٹ بھی ہر تیسرے چوتھے سال بدل جایا کرتا تھا مگر سیکریٹری مس شیخ اور چہر اسی افضل بدستور چلے آ رہے تھے۔ مس شیخ شروع میں بحیثیت ایک مؤکل... والد صاحب کے پاس آئی تھیں۔ بد قسمتی سے شادی سے ایک ہفتے قبل ان کے ہونے والے دولہا کو جو ان کا کزن بھی تھا چند پلاٹر لوگوں نے دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا تھا۔ والد صاحب اگرچہ فوجداری مقدموں سے پرہیز کیا کرتے تھے مگر مس شیخ کی غم ناک داستان نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ وہ ہر صورت قاتلوں کو کیفر کر وار تک پہنچانے پر قائل ہو گئے۔ مس شیخ نے بھی طاقتور حرفوں سے مرعوب ہوئے بغیر اس کیس کی پیروی میں نہ صرف والد صاحب کا بھرپور ساتھ دیا بلکہ قانونی معاملات میں بھی اپنی سمجھ بوجھ سے انہیں خاصا متاثر کیا۔ چنانچہ مجرموں کو سزا ملنے کے بعد والد صاحب نے انہیں اپنی سیکریٹری کے عہدے کی آفر کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ شادی نہ کرنے کا دائمی فیصلہ تو وہ کر چکی تھیں، اب مصروفیت کا کوئی بہانہ تو انہیں درکار ہی تھا۔

اسی دفتر میں ایک چھوٹی سی میز اور ایک عدد کرسی ابا جان نے مجھے کامیابی کے انعام کے طور پر عطا کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے مجھے کچھ عرصے ان کے دفتر میں بیٹھ کر وکالت کے اصل اسرار و رموز سیکھنا چاہئیں مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ چنانچہ میں سارا دن اپنی میز پر بیٹھا سنسنی خیز اور مادی حوا سے بھرپور جاسوسی ناول پڑھتا رہتا

مقدمے تھے اور انہیں ڈیل کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ مقدمے بھی ٹوکوں کو لوٹا دیے جائیں۔ مس شیخ کی بھی یہی خواہش تھی۔ انہوں نے فائلیں لاتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ ہیں وہ مصروفیات جنہوں نے ملک صاحب کی جان لے لی۔ میری تو خواہش ہے کہ تم ان کیسوں سے جان چمڑاؤ۔ ویسے بھی اب میں ریٹائر ہونا چاہتی ہوں۔“

”بھی سے آئی“ میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا ”بھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟“

”فضول باتیں مت کرو لڑکے۔“ وہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان معاملات کی فائلیں لے کر آئیں جو مقدمات کے علاوہ تھے۔ ان میں مشاورتی، وصیتوں کے اور وہ اہم معاملات تھے جن میں ایک شخص کو وکیل کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہ فائلیں انہوں نے میز کی خالی جگہ پر نکادیں۔ میں نے اس انبار پر نظر ڈالی اور کرسی کی پشت سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ عدالتوں میں جاری تمام کیس معذرت کے ساتھ واپس کر دیے جائیں۔“

”مجھے یقین تھا کہ آپ یہی فیصلہ کریں گے۔“ مس شیخ مسکرائیں۔

”تب آپ فوراً سے پیشتر یہ انبار میرے سامنے سے اٹھالیں۔ اسے دیکھ کر میرا پی پی ہائی ہوا جا رہا ہے۔“ میں نے مقدمات کی فائلوں کی طرف اشارہ کیا ”ویسے بھی میں ایک سو ہو کر دیگر معاملات کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور“ مس شیخ اسی مستعدی سے فائلیں اٹھا کر واپس جانے لگیں۔

کچھ دیر بعد میز پر صرف وہی فائلیں رہ گئیں جن کا تعلق عام قانونی امور سے تھا۔ ان کی تعداد بھی درجن بھر کے لگ بھگ تھی۔ میں نے باری باری ان میں رکھے کاغذات اور دستاویزات کا معائنہ شروع کر دیا۔ تیسری فائل خاص بھاری تھی اور اس کی حالت بتاری تھی کہ اسے عرصہ دراز سے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ یہ ایک وصیت نامہ تھا۔ جو وحید الرحمن نامی شخص نے اپنی بیٹی سیما کے حق میں کیا تھا۔ اس نے اپنی تمام جائیداد اور کاروبار کا واحد وارث اپنی بیٹی کو قرار دیا تھا۔ متبادل وارث کے طور پر اس نے اپنے بھائی حمید الرحمن کو نامزد کیا تھا۔ مس سیما کو جائیداد کا دوبارہ ایکس سال کی عمر میں ملنا تھا۔ اگر وہ اس عمر سے پہلے انتقال کر جاتیں تو جائیداد وغیرہ کو ایک ٹرسٹ قائم کر کے اس کے حوالے کر دیا جاتا۔ اگر مس سیما ایکس سال کی عمر کے بعد انتقال کر جاتیں تو ان کی جائیداد کا دوبارہ حمید الرحمن یعنی اس کے چچا کو مل جاتا۔ یہ ایک سیدھا سادہ وصیت نامہ تھا۔ اس کیس میں والد صاحب کو بطور وکیل وصیت کا حکم مقرر کیا گیا تھا۔ وحید الرحمن نے اپنے

بابا پھر واک مین پر گانے سنتا۔ ظاہر ہے کہ ابا جان میری اس روش سے قطعاً خوش نہ تھے۔ وہ آتے جاتے مجھے سدا حارنے کی اپنی پوری کوشش کرتے مگر آخر کار انہوں نے وقت کی کمی کے باعث باطل ناخواستہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا کہ میں کبھی نہ کبھی تو ”سدا سر“ ہی جاؤں گا۔

وکالت اور عدالتی چکروں میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود میں تھوڑے عرصے میں اس زندگی کے بارے میں وہ کچھ جان گیا جو پچھلے پچیس سال میں نہیں جان پایا تھا۔ ہمارا عدالتی نظام کچھ اس نوعیت کا تھا کہ پیسہ اس کے ترازو کے پلڑے تھے۔ حق و انصاف کے ایک پلڑے میں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اگر اس میں پیسے کا وزن شامل نہ ہو۔ نظام عدل میں ایسی شخصیات شامل تھیں کہ کسی مظلوم کو انصاف حاصل کرنے کے لیے خطر کی عمر اور قانون کا خزانہ چاہیے تھا۔ کامیابی کی امید پھر بھی عبث تھی۔ چونکہ ابا جان کا شمار بھی ان وکلا میں ہوتا تھا جو مؤکل کے حق پر ہونے سے زیادہ اس فیس کو مد نظر رکھتے ہیں جو کہ مؤکل انہیں ادا کر رہا ہو۔ چنانچہ ان دنوں مقدمے اور پیشیاں ان پر ٹوٹ کر برس رہی تھیں۔ ویسے بھی زرعی سیزن کا اختتام تھا۔ زمینوں والے اپنی فصلوں کی رقوم اور اپنے باپ دادا کے چھوڑے ہوئے بے معنی مقدمے لے کرنے سرے سے خم ٹھونک کر عدالتوں میں آگئے۔ ابا جان کی مصروفیت میرے لیے رحمت بن گئی مگر یہی مصروفیت پھر ان کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوئی۔ ایک رات سوتے میں انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہیں طبی امداد کے لئے اسپتال لے جایا گیا مگر ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ بعد میں ہمارے فیملی ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ انہیں گزشتہ تین سال سے دل میں تکلیف تھی۔ اس نے ابا جان کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ اپنی مصروفیات میں کمی کریں مگر انہوں نے اس ہدایت پر قطعاً عمل نہیں کیا تھا۔

ابا جان کے چالیسویں کے بعد میں دوبارہ ان کے آفس جانے لگا، جو اب میرا آفس ہو چکا تھا۔ اس دوران میں اکثر مؤکل، وکیل صاحب کی وفات کا سن کر اپنے مقدمے واپس لے جا چکے تھے مگر پھر بھی مقدموں کی ایک بڑی تعداد دفتر میں موجود تھی۔ اس وقت بھی میں اپنی میز پر فائلوں کا وہ انبار دیکھ رہا تھا جو مس شیخ لالا کراس پر ڈھیر کرتی جارہی تھیں۔ انہوں نے فائلوں کا ایک اور پلندہ لا کر میز پر بٹھا۔

”یہ ہو گئیں ان تمام مقدموں کی فائلیں جو ان دنوں ملک صاحب ڈیل کر رہے تھے۔“ انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا ”یہ تمام مقدمات اس وقت عدالتوں میں ہیں، جن کیسوں کی پیشیاں پڑ گئی تھیں، وہاں میں نے فیا کو بھیج کر تارخیں لے لی ہیں۔“ انہوں نے ایک جو نیرو وکیل کا نام لیا ”اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔“ وہ کمرے سے نکل گئیں۔

یہ لگ بھگ درجن بھر مقدموں کی روداد تھی، سب دیوانی

ہو۔" میں نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟" ان کی یہ "کیوں" خاصی معنی خیز تھی۔ اس کے پیچھے جیسے کئی ایک سوالات چھپے ہوئے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مس شیخ اس معاملے سے متعلق بہت کچھ جانتی ہیں، کوئی خاص بات مگر میرے سامنے زبان کھولنے کے بجائے وہ میرا جذبہ تجسس ابھار رہی تھیں۔

"اس کیوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے مجھے شاید نور گڑھ جانا پڑے گا" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ویسے بھی وصیت نامے کی تکمیل کی مدت قریب ہے اور ابا جان کے وارث کی حیثیت سے یہ ذمہ داری بہر حال مجھے ہی پوری کرنی ہے۔"

"شاید آپ کا خیال درست ہو۔" مس شیخ کا انداز مبہم تھا۔
 "اس وصیت سے متعلق کوئی اور کاغذ یا دستاویز ہے؟"
 "نہیں، دفتر میں کسی ایک معاملے سے متعلق تمام کاغذات کو ایک ہی جگہ رکھا جاتا ہے۔"

مس شیخ کے جانے کے بعد میں نے دوسری فائلوں کو دیکھا مگر کسی میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ یہ سب عام قانونی امور سے متعلق تھیں۔ گویا اب صرف ایک ہی معاملہ توجہ طلب تھا اور یہ تھانہ کوہ وصیت نامہ اور اس میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ والد صاحب نے اپنی ایک اہم ذمہ داری سے روگردانی کی تھی۔ یہی بات میری الجھن کا سبب تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید ابا جان کے اسٹڈی روم میں اس معاملے سے متعلق کوئی اہم بات معلوم ہو سکے کیونکہ وہ وہاں بھی قانونی امور سے متعلق کاغذات اور اشیاء وغیرہ رکھا کرتے تھے۔

شام کو گھر پہنچ کر میں اسٹڈی روم میں جا گھسا۔ یہاں دنیا بھر کی قانون کی کتابیں اور رسائل موجود تھے۔ یہیں پر ایک الماری میں ابا جان کی پرنٹس سے متعلق دستاویزات موجود تھیں مگر تقریباً ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد بھی نتیجہ صفر رہا۔ ان میں سے اکثر ان مقدموں سے متعلق تھیں جو ابا جان جیت گئے تھے۔ بہر حال میرے مطلب کی کوئی چیز اس میں نہیں تھی۔ میں منہ لٹکائے بیٹھا تھا کہ میری نظر اسٹڈی میں رکھے سیف پر پڑی اور میں اچھل پڑا۔ یہ نمبروں والا سیف تھا اور اس کے نمبرامی جان کو معلوم تھے۔ ان سے نمبر معلوم کر کے میں نے اسے کھولا۔ اندر تین خانے تھے، ایک میں گھر کی اشیاء جن میں امی کا زیور، چمک، بک اور کیش وغیرہ موجود تھا۔ دوسرے خانے میں اہم خاندانی دستاویزات تھیں جن میں جائداد اور مکان وغیرہ کے کاغذات تھے۔ تیسرے خانے میں ابا جان کے کیوبز سے متعلق اشیاء تھیں۔ ان میں ان کو ملنے والے سرٹیفکیٹ، اعزاز اور میڈل وغیرہ شامل تھے۔ مگر میرے کام کی کوئی چیز یہاں بھی نہ تھی۔

اچانک مجھے سیف کے خفیہ خانے کا خیال آیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں بھی مجھے مایوسی ہوگی مگر خلاف توقع ایک چمک بک کل

بھائی حمید الرحمن کو اپنی جائداد کا گمراہ اور اپنی لڑکی کا گارجین مقرر کیا تھا۔ والد صاحب کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ ہر سال نور گڑھ کا دورہ کر کے یہ اطمینان کریں کہ مس سیما کی پرورش و دیکھ بھال اور وحید کارپوریشن کا کاروبار صحیح طور سے چل رہا ہے۔ فائل میں گزشتہ بارہ سال کی رپورٹیں تھیں مگر آخری دو برسوں کی رپورٹیں غائب تھیں۔

میں نے تفصیل سے پچھلے بارہ سال کی رپورٹیں پڑھیں۔ ان رپورٹوں میں والد صاحب نے تمام معاملات کو تسلی بخش قرار دیتے ہوئے لڑکی کو تعلیمی پروگریس اور وحید کارپوریشن کی مالی حالت تفصیل سے بیان کی تھی۔ کارپوریشن کا بزنس ہی کروڑوں کی مالیت کا تھا۔ اس میں ایک کائن فیکٹری اور ایک آئل مل شامل تھی۔ جبکہ وحید الرحمن نے وسیع زرعی اراضی اور شہر میں خاصی بڑی جائداد بھی چھوڑی تھی۔

وحید الرحمن کا وصیت نامے پر دستخط کے دو سال بعد یعنی آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کی لڑکی سیما تقریباً چھ سال کی تھی۔ وہ ایک بورڈنگ اسکول میں پہلی کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد کی سال بہ سال کی تعلیمی رپورٹ بھی فائل میں موجود تھی۔ دوران تعلیم اس کا رجحان مصوری اور مجسمہ سازی کی طرف رہا تھا اور اس نے متعدد مقابلوں میں حصہ لے کر کئی ایک انعامات بھی حاصل کیے تھے۔ آخری تعلیمی رپورٹ میں جو دو سال قبل کی تھی اس کی ہائی اسکول کی سند بھی شامل تھی۔

ابا جان کی اس بے قاعدگی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسے معاملات میں کسی قسم کی بے قاعدگی یا بے اصولی کے روادار نہیں تھے۔ اگر انہوں نے اس معاملے سے ہاتھ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اصولاً تو اس فائل کو یہاں موجود ہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مگر میں نے احتیاطاً مس شیخ سے پوچھ لیتا بہتر سمجھا۔ وہ بولیں "ملک صاحب نے اس وصیت نامے کے معاملے سے ہاتھ ہرگز نہیں اٹھایا تھا۔ کیونکہ اس کی فائل بدستور ہمارے ریکارڈ میں موجود رہی ہے مگر اس معاملے میں ان کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ انہوں نے وصیت نامے کی ذمہ داری کے برعکس اپنے فرض سے بے پروائی برتی تھی۔ میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی مگر وہ ٹال مٹال گئے تھے۔ خاص طور پر نور گڑھ کے آخری دورے کے بعد تو وہ جیسے اس وصیت نامے کو فراموش کر بیٹھے تھے۔"

"ان کے اس رویے کی کوئی وجہ؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"کچھ کہنا دشوار ہے۔ حیرت انگیز طور پر نور گڑھ والوں کی طرف سے بھی کوئی رد عمل دیکھنے میں نہیں آیا، ان کی طرف سے بھی مکمل خاموشی چھائی رہی۔"

"ہو سکتا ہے کہ ابا جان کا ان سے براہ راست کوئی رابطہ

”قبضے میں وحید پیلس کس طرف ہے؟“

”آپ شاید یہاں نئے آئے ہیں۔“ خوش مزاج کیشر نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا ”وحید پیلس بالائی نور گڑھ کی طرف ہے۔“ اس نے مجھے تفصیل سے وحید پیلس کا راستہ سمجھایا۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے گیراج پہنچا تو کار تیار تھی۔ میں نے ایک اسپرڈ ویل بھی لے لیا کہ کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں قبضے کے زیریں حصے سے نکل کر بل کھاتی سڑک پر بلندی کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ حصہ زیریں حصے کی نسبت زیادہ خوب صورت تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ یہاں اُمر اور دُوسا بٹتے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ خوب صورت بنگلے اور حویلیاں بنی نظر آرہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف راستے پھوٹ رہے تھے جو ان بنگلوں اور حویلیوں تک جا رہے تھے۔ ایک راستے پر مجھے وحید پیلس کا بورڈ نظر آیا۔ خوش نما پتھروں سے بنی یہ سڑک بلندی کی طرف وحید پیلس پر جا کر اختتام پزیر ہوئی۔

سُرمئی رنگ کی وہ وسیع و عریض عمارت سچ مچ کوئی پیلس دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف خوب صورت لان پھیلا ہوا تھا۔ جس میں متعدد پھولوں اور پھلوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ میں نے ہفتہ بھر قبل ہی اپنے آنے کی اطلاع اور مقصد بذریعہ ٹیلی گرام یہاں بھجوا دیا تھا اس لیے میرا نام سنتے ہی گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے فوراً بڑے گیٹ کو کھول دیا اور میں کار اندر لے گیا۔ کار پورچ میں بھی ایک ملازم نما شخص استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے تیزی سے کار کا دروازہ کھولا۔ اترتے ہوئے میری نظر پورچ میں کھڑی سرخ کنور ٹیبل پر پڑی اور اسی پر جم گئی۔

”سلام صاحب!“ ملازم نما شخص نے سلام کیا پھر میری نظروں کا ہدف دیکھ کر دانت نکال دیے ”یہ سیمابی بی کی گاڑی ہے۔ آئیے میں آپ کو آپ کا کمراد دکھا دوں۔“ اس نے گاڑی سے میرا سامان اٹھا لیا اور آگے چلنے لگا۔ ”صاحب کی طبیعت صحیح نہیں ہے اس لیے وہ نہیں آسکے۔ وہ کل آپ سے ملیں گے۔ تب تک آپ تھکن اتار لیں“ اس کی قہقہے کی طرح چلتی زبان میں راستہ کٹ گیا۔ وہ مجھے وحید پیلس کے مغربی حصے کے ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرہ خاصا خوب صورت اور تمام سہولیات سے آراستہ تھا۔ اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نہ لیں۔ جب تک میں آپ کے لیے چائے یا کافی جو آپ پسند کریں لے آؤں۔“

”چائے“ میں نے بیگ سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے جاتے ہی میں باتھ روم میں گھس گیا۔ جب نماہو کر تازہ دم باہر آیا تو ملازم جس کا نام رشید تھا، چائے کے ساتھ ٹرالی بھر کر دوسرے لوازمات بھی لے آیا تھا۔ چائے پینے کے دوران میں اس نے وحید پیلس کی تفصیلی تاریخ اور یہاں رہنے والوں کا تعارف بھی گویا چائے میں گھول کر پلا دیا۔ مثلاً حمید الرحمن صاحب کے دو بیٹے

آئی۔ یہ ایک تجارتی بینک کی چیک بمک تھی اور اس میں میری معلومات کی حد تک ابا جان نے کوئی اکاؤنٹ نہیں کھولا تھا مگر چیک بمک ایک ٹھوس شہادت کے طور پر موجود تھی۔ اس چیک بمک نے میری انجمن کا دوا کرنے کے بجائے اسے اور بڑھا دیا تھا۔

”اگر ابا جان نے ایک نیا اکاؤنٹ کھولا بھی تھا تو اسے ہم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے اسٹڈی میں ٹپلتے ہوئے سوچا۔ چیک بمک جون انیس سو بانوے میں جاری کی گئی تھیں۔ یعنی والد صاحب کے نور گڑھ کے آخری دورے کے تقریباً فوراً بعد یہ اکاؤنٹ کھلایا گیا تھا۔ چیک بمک پوری تھی اور اکاؤنٹ سے ایک دفعہ بھی رقم نہیں نکلائی گئی تھی۔

اگلے روز میں بینک جا پہنچا۔ وہاں گول مٹول سے نرم و نازک نیجر نے میرا استقبال کیا۔

”مجھے ملک صاحب کے انتقال کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ میری طرف سے دلی تعزیت قبول کریں۔ میں خطر تھا کہ آپ کی طرف سے کوئی اکاؤنٹ کے متعلق بات کرنے کے لیے آئے۔ وہ خاصا باتونی لگ رہا تھا۔ بہر حال میری فرمائش پر اس نے فوری طور پر اکاؤنٹ کی اسٹیٹ منٹ مہیا کر دیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اکاؤنٹ میں بارہ لاکھ پچپن ہزار سے زیادہ رقم موجود تھی۔

نیجر کہہ رہا تھا ”ملک صاحب نے پونے تین سال پہلے دس لاکھ روپے ڈپازٹ کرائے تھے۔ جو اسٹریٹ کے ساتھ بڑھ کر بارہ لاکھ پچپن ہزار، دو سو بیاسی روپے اور ساٹھ پیسے ہو گئے ہیں پھر انہوں نے بڑی دوراندیشی دکھائی جی کہ اکاؤنٹ کو چھیڑا بھی نہیں۔ اب یہ رقم آپ کے لیے سرمایہ ثابت ہوگی۔ اگر آپ ابھی اس کو نہ نکالیں تو پانچ سال بعد دو گنی سے زیادہ رقم آپ لے سکیں گے۔“ نیجر ایک موٹی اسامی کی حیثیت سے میری خاطر تواضع کے ساتھ اپنی قوت گفتار اور شیریں بیانی سے مجھے پرچانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر میرا ذہن ان دس لاکھ روپوں میں اٹکا ہوا تھا جو والد صاحب نے ڈپازٹ کرائے تھے۔ یہ بات بڑی معنی خیز تھی کہ انہوں نے یہ کام نور گڑھ سے آنے کے بعد کیا تھا۔ کیا وہ یہ رقم وہیں سے لائے تھے۔ مگر کیوں؟

اسی وقت میں نے نور گڑھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔



جب میں نور گڑھ میں داخل ہو رہا تھا تو سورج زوال پزیر تھا۔ یہ اس چھوٹے سے شہر کا زیریں حصہ تھا۔ جو زیادہ تر بازار اور کاروباری دفاتر پر مشتمل تھا۔ میں نے کار ایک پیڑول پمپ پر روکی۔ وہاں سروس اسٹیشن بھی تھا۔ میں نے پیڑول بھروانے کے علاوہ کار کی چیکنگ بھی کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں سڑک کے پار ایک چھوٹے سے کیفے میں وقت گزارنے اور چائے پینے کے لیے چلا آیا۔ کاؤنٹر پر بل ادا کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے کیشر سے پوچھا۔

”مجھے ایڈووکیٹ ساجد ملک کہتے ہیں۔ امجد ملک میرے والد مرحوم تھے۔ آپ یقیناً مس سیماء کے چچا اور گارجین حمید الرحمن صاحب ہیں۔“ میں نے لفظ گارجین پر زور دیا۔

”آپ میرے ساتھ“ اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور ایک سمت چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک کنگ سائز سوٹمنگ پول کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہاں میز پر بے نوشی کے تمام تر لوازمات بچے ہوئے تھے۔

”آپ شوق فرماتے ہیں؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”جی نہیں، شکریہ! ابھی تک اس سے محفوظ ہوں۔“

”بہت خوب!“ اس نے اپنا جام اٹھاتے ہوئے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا ”محفوظ یا محروم؟“ پھر وہ اچانک سنجیدگی سے بولا ”آپ نے اس وقت بغیر کسی کو بتائے باہر نکل کر غلطی کی۔ رات کو میرے پالتو کتے لان پر کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ وہ یہاں پائے جانے والے کسی بھی اجنبی کی تگابوئی کر سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے لیے اجنبی ہی ہوتے“ آخر میں اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ وہ واضح طور پر مجھے دھمکا رہا تھا۔

”سوری! دراصل رات کھانے کے بعد میں چمپل قدمی ضرور کرتا ہوں“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”اب شرمندہ مت کریں۔ میں دراصل آپ کو خبردار کر رہا تھا“ پھر اس نے موضوع بدل دیا ”آپ سیماء کی باتوں کا بُرا مت مانئے گا۔ دراصل پہلے ماں اور پھر باپ کی جدائی نے اسے کچھ چڑھا اور ضدی بنا دیا ہے۔ وہ لوگوں کو چونکا کر انہیں تنگ کر کے محظوظ ہوتی ہے۔“

”میں نے بُرا مانایا بھی نہیں ہے“ میں نے فوری طور پر مسکرا کر اپنے خوش ہونے کا تاثر دیا۔ پھر تھوڑی دیر ہم دونوں کے درمیان وصیت نامے پر عمل درآمد کے متعلق گفتگو ہوئی اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

مجھے نیند آرہی تھی اور ابھی میں سونے کے بارے میں غور کر رہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میری نظر بے اختیار گھڑی کی طرف اٹھ گئی۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ میرے ذہن میں اندیشے سرسرا نے لگے۔ اگر باہر موجود شخص کے ارادے نیک نہ ہوئے اور وہ کسی خطرناک ہتھیار سے بھی مسلح ہوا تو مقابلے کی صورت میں میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا کہ وفات پا جاؤں کیونکہ میرے پاس ہتھیار کے نام پر ناخن تراش تک نہیں تھا۔ جبکہ کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے میں اپنا دفاع کر سکتا۔ دستک دوبارہ ہوئی اور میں نے دل کڑا کر کے چٹنی گرا دی۔ دروازہ بڑی آہستگی سے کھلا اور اس میں سے آفتِ جان یعنی سیماء الرحمن بڑے سرا سر انداز میں اندر آئی۔

”مس سیماء! اس وقت آپ؟“ میں نے پریشانی سے کہا۔

”ہیں واحد الرحمن اور عزیز الرحمن۔ ان کی بیگم بڑی سخت طبیعت کی خاتون ہیں۔ سیماء بی بی تین سال بعد دو مہینے پہلے وحید بیس آئی ہیں۔ وہ شمر کے ایک کالج میں مصوری اور مجسمے بنانا سیکھ رہی تھیں۔ وہ بہت غصہ ور اور موڈی ہیں۔ ان سے سب نوکر ڈرتے ہیں۔ حمید الرحمن صاحب نوکروں کے معاملے میں بہت سخت ہیں اور یہ کہ واحد الرحمن، سیماء بی بی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“

”تو گویا ایک رقیبِ رویاہ یہاں پہلے سے موجود ہے“ یہ جان کر کہ سرخ کنور ٹیبل والی حسینہ ہی دراصل سیماء رحمٰن ہے۔ میرا دل کچھ سُرمال میں دھڑکنے لگا تھا۔ رات کا کھانا بھی میں نے اپنے کمرے میں ہی کھایا۔ کھانے کے بعد میں تھوڑی چمپل قدمی کا عادی ہوں۔ اس لیے ٹھننے کے ارادے سے باہر لان میں نکل آیا۔ ہوا میں ایک خوش گوار خنکی تھی۔ فضا میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ لان کی تراش خراش اور جگہ جگہ بچھے ہوئے پھولوں کے تختے ظاہر کر رہے تھے کہ یہاں کا انتظام کسی ماہر مالی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دریا لائنس کے پول لگے تھے جن کی روشنی اندھیرے کو کامیابی سے دور کر رہی تھی۔ میں پُرسکون ماحول سے لطف اٹھاتے ہوئے لان کے بعید گوشوں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک تیز آواز نے مجھے اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے بوکھلا کر آواز کی سمت دیکھا۔ یہ مس سیماء تھی۔

”بچہ... چمپل قدمی کر رہا تھا“ میں تھوڑا سا ہکھلایا۔

”مگر کس کی اجازت سے؟“ اس کا لہجہ بہت خراب تھا۔ اب کہ میرا موڈ بھی آف ہو گیا۔

”محترمہ، آپ شاید مہمانوں سے بات کرنا جانتی ہی نہیں ہیں“ میں نے بھی تلخ انداز میں کہا ”میں آپ کے والد مرحوم کا وکیل ہوں اور ان کی وصیت کی تکمیل کے لیے یہاں آیا ہوں۔“

”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“ وہ غرائی ”ہو سکتا ہے کہ آپ کوئی فراڈیے ہوں“ ابھی میں سخت طیش کے عالم میں اس ناہنجار لڑکی کو کوئی مناسب جواب دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

”یہ درست کہہ رہے ہیں سیماء بیٹی!“ یہ ایک ادھیڑ عمر مگر باوقار سا شخص تھا۔ آواز میں بھاری پن کے باوجود نرمی موجود تھی۔ ”یہ ہمارے مہمان ہیں اور مہمانوں کے ساتھ ایسا مذاق نہیں کرتے۔“

”میں تو... میں تو چچا جان...“ لڑکی کسی قدر بدحواس ہو رہی تھی۔ اس کی ساری تیزی طراری ہوا ہو چکی تھی۔

”آپ اپنے کمرے میں جائیے“ ادھیڑ عمر شخص جو یقیناً حمید الرحمن تھا، بدستور نرمی سے بولا اور لڑکی ایسے وہاں سے بھاگی جیسے اس نے کسی آدمِ خور شیر کی دھاڑ سن لی ہو۔

امکان یہی تھا کہ ان لوگوں کا تعلق اسی پبلس سے ہے پھر حیدر الرحمن کی دھمکی۔ ان سب سوچوں کے ذہن میں در آتے ہی خطرے کا احساس پوری شدت سے جاگ اٹھا۔ ابھی میں وہاں سے خاموشی سے بھاگ نکلنے کی سوچ رہا تھا کہ پردے کے پیچھے سے سیمہ کی آواز آئی۔

”ساجد، آپ کہاں ہیں؟“

”یہیں ہوں اور اب واپس جا رہا ہوں“ میں نے خاصی رکھائی سے کہا مگر وہ ہولے سے چیخ اٹھی۔

”نہیں، ابھی آپ واپس نہیں جاسکتے۔ ابھی تو میں نے آپ کو وہ چیز ہی نہیں دکھائی جس کے لیے میں آپ کو یہاں لائی ہوں۔“

”تو دکھا بھی چکیں ورنہ میں واپس جا رہا ہوں۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا اور وہ جلدی سے پردے کے پیچھے سے نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سیاہ ڈبا تھا مگر میں نے اس پر توجہ نہ دی کیونکہ میری تمام تر توجہ خود اس پر تھی۔ اس نے اپنا لباس تبدیل کر کے ایک چست اور جدید تراش کا لباس پہن لیا تھا۔ یہ لباس اس کی جسمانی تراش کو بڑی خوب صورتی سے نمایاں کر رہا تھا۔ میرے دل کی رفتار بڑھنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے نظریں اس پر سے ہٹائیں۔ مجھے نظریں چڑاتے دیکھ کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی پھر بولی۔

”وہ چیز اس پردے کے پیچھے ہے مگر آپ اس وقت پردہ ہٹائیں گے جب میں کہوں گی اور جیسے ہی میں کہوں آپ فوراً پردہ ہٹالیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسری طرف کا منظر آپ مدتوں فراموش نہ کر سکیں گے۔“

اس کی ہدایت پر میں نے پردے کی ڈوری تھام لی۔ وہ میرے عقب میں کھڑی تھی۔ اس کے کہتے ہی میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ڈوری کھینچ لی۔ پردے سرعت سے سٹے اور دوسری طرف کا منظر دیکھتے ہی میرے دل کو کوچ کر گئے۔

مجھ سے بمشکل فٹ بھر کے فاصلے پر ایک گرا اینڈیل سیاہ فام جیپ کم از کم چار فٹ لمبی تلوار سرے اونچی کیے کھڑا تھا۔ اس کی بھینک سرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور ہونٹوں پر ایک سفاک سی مسکراہٹ تھی۔ اگر وہ مجھ پر وار کر دیتا تو میرے بچنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ ابھی میں اس دھچکے سے نہیں سنبھل پایا تھا کہ عقب سے سیمہ کی سرسراہٹ ہوئی سردی آواز آئی۔

”ظالوت! اسے مار ڈالو۔“ اس کے ساتھ ہی جیپ کی تلوار والا ہاتھ حرکت میں آیا۔

میں گھبرا کر پیچھے ہٹا مگر مجھے یقین تھا کہ میں اس کی تلوار کی رینج سے نہیں نکل پاؤں گا۔ اس کو شش میں میرا پاؤں پھسلا اور میں پشت کے بل زمین پر جا گرا۔

سیمہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ میں نے جیپ کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ واپس اوپر اٹھ چکا تھا مگر وہ بالکل ساکت کھڑا تھا۔ اس لمحے

”دراصل میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔“

”تو یہ کون سا وقت ہے معافی مانگنے کا! آپ صبح بھی یہ کام کر سکتی تھیں۔ اس وقت کوئی آپ کو یہاں دیکھ لے تو۔۔۔ میں نے بدستور اپنی پریشانی کا اظہار جاری رکھا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”کوئی نہیں دیکھے گا، سب سو رہے ہیں اور ابھی تو میں آپ کو اپنا اسٹوڈیو دکھاؤں گی“ وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

”مگر میں اس وقت اسٹوڈیو نہیں، خواب دیکھنے کے موڈ میں ہوں۔ اسٹوڈیو آپ مجھے صبح دکھا دیجئے گا“ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے کیونکہ وہ ارادوں کو ہالے جانے والے حسن کی مالک تھی اور ظاہر ہے کہ ایک مرد کو بہکتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔

”پلیز، آپ میری بات مان لیں۔“ وہ لجاجت بھرے انداز میں بولی ”صبح میرے لیے یہ سب ممکن نہیں رہے گا۔ پلیز آپ صرف تھوڑی دیر کے لیے چلیں۔ اگر آپ نے انکار کیا تو میں سمجھوں گی کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا ہے۔“ اس نے روٹھنے والے انداز میں کہا۔

”مگر آپ مجھے کیوں لے جانا چاہ رہی ہیں؟“ اس کے اصرار وادانے مجھے تقریباً رضامند کر لیا تھا۔

”میں آپ کو ایک خاص چیز دکھانا چاہتی ہوں“ اس کا انداز کچھ پراسرار سا تھا۔ بہر حال میں عقل کو بالائے طاق رکھ کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کیونکہ جب اتنی خوب صورت اور جوان لڑکی رات کے اس پہر ساتھ چلنے پر اصرار کرے تو اکثر مرد اپنی عقل بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

ہم لوگ جاسوسی فلموں کے کرداروں کی طرح چھپتے چھپاتے اور دبے پاؤں چلتے، اس کے اسٹوڈیو تک پہنچ گئے جو پبلس کی عمارت سے متصل ایک چوڑے سے ہشت پہلو کمرے میں بنا ہوا تھا۔ اندر بھی وہی ماحول تھا جو ایک مصور اور مجسمہ ساز کے اسٹوڈیو کا ہو سکتا ہے۔ جگہ جگہ برش رنگ کے ڈبے اور ٹیوبس، کیوس، ایل، مجسمہ سازی کے اوزار اور میٹرل بکھرا پڑا تھا۔ کیس کیس تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ وہ ایک اچھی آرٹسٹ تھی اور کم عمری کے باوجود بھی اس کے کام میں خاصی نفاست اور پختگی موجود تھی۔ اکثر بینشنگز کا موضوع انسان اور ان کے جذبات تھے مگر مجھے اس کا کوئی مجسمہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ خود بھی غائب تھی۔ اسٹوڈیو میں آتے ہی وہ ایک کونے میں لگے پردے کے عقب میں چلی گئی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہاں آکر میں نے خاصی بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ کچھ لوگوں کو میرا نور گڑھ اتنا قطعی پسند نہیں آیا ہے۔ انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کی کچھ کوششیں بھی کی تھیں مگر ابھی میری زندگی باقی تھی۔ غالب

نچا کر کچھ کتا ہوا کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ شاید وہ کمرے سے چلا گیا تھا۔ کیونکہ سیمانے خاصی نفرت انگیز نظروں سے اس سمت میں دیکھا تھا۔ تھپر کھا کر اس کی آنکھوں میں جیسے اداسی اتر آئی تھی۔ وہ صوفہ کم بیڈ کی پشت سے نکلی بڑی افسردہ سی نگاہوں سے خلا میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کے قریب بیڈ شیٹ پر ایک لمبی پرنٹ تھی۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ اڑ کر اس کے پاس جا پہنچوں۔ مگر پھر مجھے تھوڑی دیر پہلے والا ”ذائق“ یاد آیا اور میرا جذبہ ہمدردی ماند پڑنے لگا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ حمید الرحمن نے اسے تھپر کیوں مارا۔ کیا اسے میرے ساتھ کیے جانے والے مذاق کا علم ہو گیا تھا یا کوئی اور معاملہ تھا۔ بہر حال مجھے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ سیمانے کے ساتھ اس کا رویہ درست نہیں تھا اور وہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے دریغ بھی نہیں کرتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں حمید الرحمن اپنی بیٹی کی کو ایب نارل ظاہر کر کے اس کی جائداد کا دوبارہ اپنے قبضے میں نہیں رکھنا چاہ رہا ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ کئی احمقانہ خیالات میرے ذہن میں آئے حتیٰ کہ میں بستر پر گر کر نیند کی آغوش میں جا پہنچا۔



صبح تک رات کے واقعے کا اثر بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ آج سے میں نے وحید کارپوریشن اور وحید الرحمن کی جائداد وغیرہ کے اکاؤنٹوں کی چھان بین کرنی تھی۔ وصیت نامے کی رو سے یہ وکیل کا لازمی فرض تھا کہ وہ اطمینان کر لے کہ کہیں کسی معاملے میں کوئی گزربڑیا گھپلا تو نہیں ہوا ہے۔ پہلے میں نے وحید کارپوریشن کے حسابات چیک کرنا ضروری سمجھے۔ میں نے اس سلسلے میں حمید الرحمن کو اطلاع دے دی تھی۔ چیکنگ کے لیے میں نے ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور ایک انڈسٹریل کنسلٹنٹ کو جب کیا تھا۔ وہ دونوں بھی یہاں پہنچ چکے تھے۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کو کارپوریشن کے مالیاتی حسابات اور اعداد و شمار کے لیے جرح چیک کرنا تھا۔ جبکہ انڈسٹریل کنسلٹنٹ کو کارپوریشن کے تحت چلنے والے کارخانوں کی حالت کا جائزہ لینا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خالص ٹیکنیکی نوعیت کے کام تھے، مجھے صرف ان سے حاصل شدہ رپورٹس کو دیکھنا تھا۔

اپنی جائداد اور زرعی اراضی کے لیے وحید الرحمن نے ایک بینک کو ٹرسٹی مقرر کیا تھا۔ ان زمینوں اور جائدادوں کی دیکھ بھال اور ان سے آمدنی کی وصولی اس کی ذمہ داری تھی۔

اس معاملے میں حیرت انگیز امر یہ تھا کہ وحید الرحمن نے اپنے بھائی کو وراثت میں ایک روپے کا بھی حق دار نہیں ٹھہرایا تھا۔ حالانکہ اس نے حمید الرحمن کو اپنی بیٹی کا سرپرست اور اپنی کارپوریشن کا منیجر ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔ اس کے باوجود کہ ان ساری خدمات کے بدلے وہ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ محض ایک ٹرسٹی کے طور پر صرف کرے، اسے کچھ نہیں مل رہا تھا۔ جہاں تک میں نے معلومات حاصل کی تھیں، حمید الرحمن کا دیگر کوئی ذریعہ

مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی آسانی سے اُلٹ بن گیا تھا۔ وہ گرائیڈل حبشی ایک مجسمہ تھا جس کا ہاتھ کسی میکینزم سے یوں حرکت میں آتا تھا کہ سامنے والے کو محسوس ہوتا جیسے وہ اس پر حملہ کر رہا ہے۔ سیمانے ہنٹے ہنٹے ہاتھ میں پکڑی ڈبیا کا رخ حبشی کی طرف کیا تو اس کا ہاتھ پھر نیچے آیا اور واپس پہلی والی پوزیشن میں چلا گیا۔

مجھے یقین ہے کہ میرا گندی رنگ اس وقت طیش میں سرخ ہو چکا تھا اور میرے ذہن میں کچھ اس قسم کے خیالات آرہے تھے کہ حبشی کے ہاتھ سے تلوار نکال کر اس سنگ دل حسینہ کی گردن اڑا دوں مگر ایک تو میں خاصا نرم دل واقع ہوا تھا۔ خاص طور سے خواتین کے معاملے میں۔ چنانچہ میں نے اٹھ کر اطمینان سے اپنے کپڑے جھاڑے اور اس سے کہا۔ ”شکریہ مس سیمانے۔ میں واقعی اس منظر کو تمام عمر یاد رکھوں گا“ میرے لہجے میں غصے کے بجائے ایک نوعیت کی سرد مہری پا کر وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی پھر کچھ ندامت سے بولی۔

”ساجد صاحب، یقین کریں میرا مقصد صرف جوک تھا۔ اگر آپ ہرٹ ہوئے ہیں تو میں....“ وہ کہہ رہی تھی مگر میں اس کی پوری بات سننے بغیر اسٹوڈیو سے نکل آیا۔

اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے راہداری میں کسی کی آہٹ سنی مگر پلٹ کر دیکھے بغیر اندر آ کر دروازہ بولٹ کر دیا۔ آج سے پہلے کبھی کسی نے مجھے اس طرح بے وقوف نہیں بنایا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میں کھولتے ذہن کے ساتھ کمرے میں ٹھہرا رہا۔ پھر باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

وحید پیلس ایک بہت پہلو عمارت تھی جس میں جدید و قدیم طرز تعمیر کا امتزاج تھا۔ اس کے ہر کونے پر مینار نما گول بُرجیاں تھیں۔ ان ہی میں سے ایک بُرجی میں مجھے کرا ملا تھا۔ یہ شمال مغرب کی سمت میں تھا۔ اس وقت میری نگاہ شمالی بُرجی کے ایک کمرے کی روشن کھڑکی پر پڑی۔ یہ پہلی منزل کا کمرہ تھا۔ جبکہ میں دوسری منزل پر رہائش پزیر تھا۔ چنانچہ اندر کا منظر بہت واضح ہو کر نظر آرہا تھا۔ اس کمرے میں سیمانے اور حمید الرحمن نظر آرہے تھے ان کی حرکات و سکنات سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں کوئی تند و تیز گفتگو ہو رہی ہے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی آواز سننا ممکن نہیں تھا۔ مگر میرے پاس ایک اچھی دور بین تھی جو میں دوران سفر ارد گرد کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے پاس رکھتا ہوں۔ میں نے جلدی سے دور بین نکالی اور اس کو ایڈجسٹ کیا۔ کمرے کا منظر اتنا واضح ہو گیا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے سامنے ہی ہو۔ بالکل کسی قلم کی طرح مگر بے آواز۔ حمید الرحمن کی پشت میری طرف تھی جبکہ سیمانے کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس پر غصے کے آثار نمایاں تھے ابھی وہ کچھ کہہ ہی رہی تھی کہ حمید الرحمن نے اچانک اس کے چہرے پر طمانچہ رسید کیا۔ وہ چکر اکر اپنی پشت پر موجود صوفہ کم بیڈ پر جا گری۔ حمید الرحمن ہاتھ

بارے میں معلوم کرنے کے لیے ٹرشی بینک کے ایک سینئر عہدے دار سے مل کر واپس آ رہا تھا۔ کار میں سیما موجود تھی۔ میں نے ہارن دیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مجبوراً مجھے کار سے اتر کر اس کی طرف بڑھنا پڑا۔ یہ دیکھ کر میں بھنا گیا کہ وہ واک مین کے ائرنون کانوں میں لگائے میوزک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”محترمہ! اپنی گاڑی ہٹائیے تاکہ میں گزر سکوں۔“ میں زور سے چیخا۔

”آہستہ بولے! میں بہری نہیں ہوں“ وہ کانوں سے ائرنون نکالتے ہوئے بولی اور کار سے اتر آئی۔ ہلکی نیلی جرسی اور سفید جینز میں اس کا سراپا رنگوں کی بہار بنا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے سر جھکائے کھڑی رہی پھر بولی ”آپ نے اس رات کی حرکت کا بُرا منایا ہے“

”جی نہیں“ میں نے ملائمت سے کہا ”آپ کے چچا مجھے خبردار کر چکے تھے کہ اکثر اوقات آپ معمول سے ہٹی ہوئی حرکات کر گزرتی ہیں لہذا مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی“ میرا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

”آئی ایم رینلی سوری!“ وہ معصومیت سے بولی ”وہ صرف ایک مذاق تھا۔ اگر آپ ہرٹ ہوئے تو میں آپ سے معافی مانگتی ہوں“ وہ سخت شرمندہ ہو رہی تھی اور میری یہ کمزوری ہے کہ میں خوب صورت لڑکیوں کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتا۔

”یقین کریں میں بالکل ہرٹ نہیں ہوا“ میں نے اسے یقین دلایا ”مگر کل آپ مجھے کہیں اور روک کر آج والی حرکت پر شرمندہ ہو رہی ہوں گی“ میں نے اس کی راستے میں کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا مطلب ہے آپ نے میری سوری قبول کر لی۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”بالکل‘ قطعی۔ اب آپ راستہ چھوڑ دیں تاکہ میں ہیلز جاسکوں۔ یقین کریں آج میں نے مصروفیت سے بھرپور دن گزارا ہے اور شدید تھکن محسوس کر رہا ہوں۔“

”تب تو آپ کو میری دعوت قبول کرنا ہوگی“ اس نے میری درخواست کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”آپ کو میرے ساتھ ہوٹل چل کر چائے پینا ہوگی“ اس کا انداز حکمیہ تھا۔ انکار کرنے سے پہلے ایک خیال ذہن میں در آیا اور میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔ اس کے کہنے پر میں نے کار سڑک کے کنارے ایک جگہ لگا دی۔ ہم دونوں کنور نیبل میں سوار ہو کر شہر کے سب سے بہترین ہوٹل میں پہنچ گئے۔ اس کی دوسری منزل پر رستوران تھا جہاں سے ارد گرد کے مناظر بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ ہم نے ایک نسبتاً کارز کی میز منتخب کی۔ ہوٹل کے معیار کے مقابلے میں اس کی سروس بہت عمدہ تھی۔ یہ اطلاع مجھے سیما نے فراہم کی تھی جو بعد میں درست نکلی۔ اس نے چائے اور سینڈویچز کا آرڈر دیا۔ چائے آنے تک اس کی زبان

آمدنی نہیں تھا۔ اس کے پاس نہ تو کوئی جائیداد تھی اور نہ کوئی زمین۔ ان حالات میں جب کہ وصیت کی رو سے سیما ہر شے کی مالک قرار پاتی تو لامحالہ وہ بھی اس کے ملازموں میں شمار ہوتا۔ وہ جب چاہتی اسے کارپوریشن سے الگ کر دیتی۔ گویا یہ عین ممکن تھا کہ وہ تمام ٹھاث باٹ اور آسانٹوں سے محروم ہو جاتا جو پندرہ برسوں سے اس کی اور اس کی اولاد کی زندگی کو جنت بنائے ہوئے تھے۔ اب اگر وہ ان آسانٹوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ ایک فطری بات تھی۔

حسابات کی چھان بین سے جو نتائج سامنے آئے تھے۔ ان کے مطابق کاروبار مسلسل ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ کارپوریشن کے تحت چلنے والی فیکٹریاں نہ صرف نفع کارہی تھیں بلکہ اس عرصے میں وہ ری نیو ہو کر جدید ترین مشینوں اور پروڈکشن فریم ورک سے لیس ہو چکی تھیں۔ ان فیکٹریوں کی پروڈکشن کیپٹی بھی سو فیصد بڑھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ حال ہی میں کارپوریشن نے ایک شوگر یونٹ لگایا تھا۔ جسے مستقبل قریب میں شوگر مل میں تبدیل کرنے کا پروگرام تھا۔ کارپوریشن کے اثاثے بڑھ کر تین گنا ہو چکے تھے۔ اس پر جو قرضے واجب الادا تھے ان کی ادائیگی باقاعدگی سے جاری تھی۔ اس دوران میں یہ بات بھی واضح طور پر سامنے آئی کہ کارپوریشن کے کلیدی عہدوں پر اکثر افراد وہی تھے جو وحید الرحمن کے زمانے میں رکھے گئے تھے۔

دوسرے لفظوں میں وحید الرحمن نے اپنی ذمے داریاں انتہائی ایمانداری اور دیانت سے پوری کی تھیں کیونکہ اگر وہ بے ایمانی پر آمادہ ہوتا تو سب سے پہلے اہم عہدوں پر اپنے اعتماد کے افراد کو لٹا اور وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کیا نہیں۔ کاغذات کی حد تک تمام معاملات انتہائی صاف تھے۔ کارپوریشن کا بورڈ آف ڈائریکٹرز چھ ڈائریکٹرز پر مشتمل تھا۔ وحید الرحمن کے علاوہ پانچ ڈائریکٹرز وہی تھے جنہوں نے وحید الرحمن کے ساتھ مل کر اس آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی تھی۔ وحید الرحمن کے دونوں بیٹے بھی کارپوریشن میں اہم عہدوں پر کام کر رہے تھے۔ واحد الرحمن شعبہ مارکیٹنگ کا ڈائریکٹر تھا جبکہ عزیز الرحمن آئل مل میں منیجر تھا۔

ہر کاغذ درست تھا۔ تمام حسابات صحیح تھے۔ کارپوریشن کے تمام معاملات صاف ستھرے تھے۔ کہیں پر بے ایمانی یا گڑبڑ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مگر میرے دل میں ایک خلش موجود تھی کہ اگر سب کچھ درست تھا تو پھر اباجان گزشتہ دو سال سے نور گڑھ کیوں نہیں جارہے تھے۔ پھر پچھلے دو سال کی رپورٹ خاص طور پر سیما کی رپورٹس کے متعلق سالانہ رپورٹ فائل میں کیوں نہ تھی۔ گویا کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور تھی اور مجھے اسی گڑبڑ کو ڈھونڈ نکالنا تھا۔

○☆☆○

سڑک پر سرخ کنور نیبل اس طرح کھڑی تھی کہ وہاں سے گزرنے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ میں زرعی اراضی کے کاغذات کے

بدولت تیز ہوا اس کے بالوں کو منتشر کر رہی تھی جو کبھی اس کے چہرے پر بچھل جاتے تھے۔

اچانک کار سڑک سے ایک کچے راستے کی طرف مڑ گئی۔ یہ راستہ ایک پہاڑی چوٹی تک جا رہا تھا۔ پہاڑی اوپر سے مسلح تھی اور وہاں سے چاروں طرف کے منظر بہت واضح نظر آرہے تھے۔ وہ کار روک کے نیچے اتری اور چوٹی کے مغربی کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے پلٹ کر مجھے بھی آنے کا اشارہ کیا۔ فضا میں ایک مہک اور تازگی رہی ہوئی تھی۔ جو ذہن کو ایک لطیف سرور بخش رہی تھی۔ میں بھی کار سے اتر کر اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

سورج غروب ہونے کے منظر کے بارے میں اس کا دعویٰ سو فیصد درست تھا۔ ڈوبتے آفتاب کی سنہری کرنوں نے ماحول کو سنہری رنگ میں رنگ دیا تھا۔ حتیٰ کہ سورج کی کرنوں نے سیما کے سراپا کی تراش کو ایک نیا حسن بخش دیا تھا۔ اس کے بال فضا میں اڑتے ہوئے ایک عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ ان کی دم بدم بدلتی رنگت نے انہیں ایک الوہی کیفیت عطا کر دی تھی۔ میرے جیسا وکالت جیسے خشک پٹیے سے تعلق رکھنے والا بھی اس سحر انگیز منظر کو دیکھ کر مبسوت ہوا جا رہا تھا۔ میرے دل کے نماں خانوں میں عجیب سی خواہشیں انگڑائیاں لینے لگیں۔

”کتنا خوب صورت منظر ہے“ وہ ایک گرمی سانس لے کر پلٹی۔ اب کرنیں اس کے گلابی گالوں پر رقصاں تھیں۔ اس لمحے وہ کوئی ماورائی مخلوق لگ رہی تھی۔ جو غلطی سے بھٹک کر اس دنیا میں آ نکلی ہو۔ میری بے خودی میں زیادہ قصور اس کا تھا مگر اس نے نہ تو مزاحمت کی اور نہ میری پیش قدمی کا برا مانا۔

تھوڑی دیر کے لیے جیسے کائنات تھم گئی تھی۔ ہر شے ساکت ہو گئی پھر وہ چونک کر مجھ سے الگ ہو گئی۔

”واپس چلیں“ اندھیرا چھانے والا ہے“ اس کی آواز میں متمہاٹ تھی۔

”کچھ دیر اور ٹھہرو۔“ میں نے عملی طور پر اصرار کیا جسے اس نے جھکا کر دے کرنا کام بنادیا۔

”بالکل نہیں“ وہ ہنسی ”واپس چلے ورنہ اندھیرے میں کار کسی کھڈ میں بھی گر سکتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، ہم صبح چلے جائیں گے۔“

میرے اطمینان پر وہ جلتے ہوئے لہجے میں بولی ”اگر جنگلی جانوروں نے چھوڑ دیا۔“

میں ہنس پڑا اور ہم دونوں آکر کار میں بیٹھ گئے۔

”کاش یہ سورج ہمیں تھم جاتا، بیٹھ کے لیے“ میں نے اسے کار اشارت کرتے دیکھ کر کہا۔

”ہوش میں آجائیے“ اس نے شوخی سے کہا اور کار اشارت کی۔ شاید وہ اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔ کیونکہ وہ بڑی مہارت سے کار پہاڑی سے نیچے اتار رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم وحید پیلس کے

طوفان میل کی طرح نان اسٹاپ چل رہی تھی۔ موضوع وہ خود تھی اور اس کے مشاغل تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے پوچھ لیا۔

”جیسی زندگی تم نے گزاری ہے اس کے متعلق کیا کہتی ہو؟“

وہ ایک دم خاموش سی ہو گئی۔ اتنے میں چائے آگئی۔

”میں نہیں جانتی کہ گھر کیا ہوتا ہے۔“ اس کا انداز سپاٹ تھا ”پاپا اپنی زندگی میں مجھے بورڈنگ میں داخل کرائے تھے۔ وہاں میں نے تہائی دور کرنے کے لیے اپنے چھوٹے سے ہاتھوں میں برش پکڑ لیا۔ میں پہلی مرتبہ اتنے عرصے گھر میں رہی ہوں۔“

”ہائی اسکول کے بعد کیا مصروفیات تھیں؟“

”ایک کالج میں فائن آرٹس میں داخلہ لیا تھا“ وہ چائے کا سب لیتے ہوئے بولی ”وہیں مجھے سازی سے دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر میں اسی... میں کھو گئی۔ فائنل کے بعد چچا جان نے واپس بلا لیا۔ اب ان کا ارادہ ہے کہ مجھے بزنس کے کٹس سکھائیں“ وہ ہنس پڑی

”کہاں فن اور کہاں بزنس۔“

”ظاہر ہے جب تم ان سب چیزوں کی مالک بن جاؤ گی تو انہیں ڈبل کرنا بھی تمہاری ذمہ داری ہوگی۔ ویسے تمہارے چچا اور ان کے گھروالوں کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہے؟“ میں نے محتاط انداز میں دریافت کیا۔

”ویسا ہی جیسا کہ ایک چچا کا بھتیجی کے ساتھ ہو سکتا ہے“ وہ کندھے اچکا کر بولی ”ویسے انہوں نے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ میرے کزنز کا طرز عمل بھی اچھا ہے“ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔

”یعنی تمہارے خیال میں کارپوریشن اور جائیداد وغیرہ کا چارج لینے میں تمہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ وہ پُر خیال انداز میں بولی ”دراصل یہ بزنس اور جائیداد وغیرہ سنبھالنا مجھے اپنے بس کا روگ نہیں لگتا۔“

میں نے اسے بغور دیکھا اور وہ لال سی ہو گئی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو“ وہ آہستہ سے بولی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیا سمجھی ”چھوڑیں ان باتوں کو۔ آئیے میرے ساتھ چلیں میں آپ کو آپ کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش منظر دکھاؤں گی“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”رات جیسا؟“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اب کے وہ جھینپ گئی۔

”میں دراصل ایک اسپاٹ سے آپ کو سن سیٹ کا منظر دکھانا چاہ رہی ہوں۔ بلوئی، اتنا خوب صورت منظر آپ نے پوری زندگی میں نہیں دیکھا ہوگا۔“

کچھ دیر بعد اس کی گاڑی بلندیوں کی طرف رواں تھی۔ میرے رنگین خیالات بھی بلندی کی طرف مائل بہ پرواز تھے۔ ظاہر ہے جب ایک خوب صورت دوشیزہ آپ کو کہیں چلنے کی آفر کرے تو رنگین خیالات تو سوچوں میں آتی جاتے ہیں۔ کار کی کھلی چھت کی

”کوئی بات نہیں حمید صاحب!“ میں نے مسکرا کر کہا ”زیادہ پینے کے بعد عموماً انسان کو ہوش نہیں رہتا“ میری بات میں چھپے خفیف سے طنز کو محسوس کر کے اس کے چہرے کے تاثرات میں مزید اتاری آگئی اور وہ خشک سے لہجے میں مجھے گڈناٹ کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں نے بھی اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”یہ شور کیا ہے؟ کیا ہوا ہے؟“ ملازم خاصا بدحواس ہو رہا تھا۔

”مگر وہ ہے کہاں؟“ بیگم حمید الرحمن نے روتے ہوئے کہا۔

یہ ایک خواب گاہ تھی اس کی حالت سے ظاہر تھا جیسے کچھ دیر پہلے یہاں خاصی ٹھنکنا ہوئی ہے۔ چیزیں بکھری ہوئی تھیں اور خاص بات بستر پر پھیلا ہوا خون تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ خون جم کر خشک ہو چکا ہے۔ جبکہ فائر بمشکل دس منٹ پہلے ہوا تھا۔ اگر یہ خون اس فائر کے نتیجے میں لگتا تو اتنی جلدی خشک نہیں ہو سکتا تھا۔ خواب گاہ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یہ اوپن ونڈو تھی اس میں گرل وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ یہ لان کا ایک حصہ تھا۔ کھڑکی کے نیچے نرم کیا ریاں تھیں اور اہم بات یہ تھی کہ مدھم مدھم روشنی کے

”اے وکیل کے بچے!“ اس نے لکار کر کہا اور لڑکھڑاتے قدموں سے میری طرف بڑھنے لگا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت منہ ہو گیا کہ اس کے ہاتھ میں وہ ہسکی کی ایک بوتل تھی جو تقریباً خالی تھی۔ اگر یہ بوتل اس نے خالی کی تھی تو وہ بلاشبہ بلا نوش تھا ورنہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوتا اس کے لیے ممکن نہ رہتا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھمکا ہوا اور میری سمجھ میں آ گیا کہ یہ شخص کیوں مجھے جانا پہچانا لگ رہا ہے۔ اس کے نقوش حمید الرحمن سے بہت ملتے تھے یعنی یہ اس کا لڑکا تھا مگر کون سا! بڑا یا چھوٹا؟ اس کا اندازہ مشکل تھا۔

وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوش خلقی سے کہا ”مجھے ایڈووکیٹ ساجد ملک کہتے ہیں۔“

”کہتے ہیں گے“ وہ ایک دم چیخا ”میری... میری بلا
... سے... ال... الو... کا... پا... ٹھا... کہتے...
... ہوں... جی... گے... اک... اگر تم... نے... سیسی... کا...
... بچھا... جی... نہ چھوڑا ات... تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“

وہ مکمل طور پر آؤٹ ہو رہا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے چمکا کر اپاؤں کہ اس نے جارحانہ انداز میں بوتل توالتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میری پھرتی نے بوتل کو کھوپڑی پر ٹوٹنے سے بچا لیا۔ وہ جمبوک میں اوندھے منہ گرا۔ بوتل چھوٹ کر ایک درخت کے تنے سے جا لکرائی اور ٹوٹ گئی۔ بوتل ٹوٹنے ہی وہ یکدم دھاڑیں مارا کر روئے لگا۔ میں نے بوکھلا کر چاروں طرف دیکھا۔ کئی ایک ملازمین دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے

سلسلہ امروہی کی بیش بہا تصانیف

مراقبہ 2 حصے	نفسیات نفسیات 3 حصے
عجائب نفس 2 حصے	عجائب نفس 2 حصے
عالم برزخ 2 حصے	عالم برزخ 2 حصے
عالم ارواح 2 حصے	عالم ارواح 2 حصے
توجہات 2 حصے	توجہات 2 حصے
حاضرات ارواح 2 حصے	حاضرات ارواح 2 حصے

قیمت فی کتاب 25 روپے | ڈاک خرچ فی کتاب 16 روپے

200 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ معاف

- کسی قسم کی نقد رقم ہفتے میں ہرگز مت رکھیں۔
- کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔
- دی پی آر سالانہ سیس کیا جاتا۔
- بیرون ملک کتابوں کی قیمت 4 امریکی ڈالر یا مساوی رقم مع اخراجات ہونگی۔
- بیرون ملک رقم صرف ڈرافٹ کے ذریعہ روانہ کریں۔
- ڈرافٹ اس نام پر بنوائیں:۔

HABIB BANK LTD. A/C 688
Mansfield Street Branch Karachi.

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس 944 رمضان چیمبرز

بلیویا سٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200

فون نمبر: 2637695 2628517 2639760

باوجود ان پرجوتوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔
میں خواب گاہ سے باہر نکل رہا تھا تو حمید الرحمن فون پر کہہ رہا تھا۔ ”جی انپکٹر۔۔۔ آپ فوراً آجائیے۔۔۔ جی میں منتظر ہوں۔“ اس نے ریسیور کرپل پر پٹخ دیا۔
اس اثنا میں ملازم واپس آگئے۔ ایک نے ہانتے ہوئے کہا ”صاحب، ہم نے پیلس کا کوٹا کوٹا چھان مارا ہے۔ مگر چھوٹے صاحب کا کہیں پتا نہیں چلا“ یہ سنتے ہی مسز حمید الرحمن نے بلند آواز سے واویلا شروع کر دیا۔
”تم سب حرام خور ہو۔ تمہاری موجودگی میں کوئی گھر میں گھسا اور میرے بیٹے کو اغوا کر کے لے گیا“ حمید الرحمن غصے سے کہہ رہے تھے۔ ”اکرم کو بلاؤ۔“
تھوڑی دیر بعد اکرم نامی شخص اس کے سامنے تھا۔ وہ پیلس کا سیکورٹی انچارج تھا۔
”اس طرح تم ہماری حفاظت کرتے ہو؟“ اس نے اکرم پر گرجنا برسا شروع کر دیا۔
میں نے دیکھا کہ وحید پیلس سے تعلق رکھنے والا ہر فرد یہاں موجود ہے، سوائے سیماء کے۔
”مس سیماء کہاں ہیں؟“ میں نے ایک ملازمہ سے پوچھا۔
”اپنے کمرے میں ہوں گی جی“ وہ بولی۔
اتنے ہنگامے اور ایک عدد فائر ہونے کے باوجود اس کے کان پر جوں نہیں رسیدگی تھی اور وہ بدستور سو رہی تھی۔ مجھے تشویش لاحق ہو گئی۔ میں نے ملازمہ سے کہا کہ وہ جا کر بی بی کو دیکھ کر آئے۔
گھر کے افراد پولیس کے انتظار میں نشست گاہ میں آگئے تھے۔ میں بھی وہیں آ گیا۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ وہی ملازمہ بڑی بوکھلاہٹ کے عالم میں اندر داخل ہوئی تھی۔
”سیماء بی بی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ میں نے پورے گھر میں دیکھا مگر وہ کہیں نہیں ملیں۔“
”کیا کہتی ہو“ حمید الرحمن اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف جھپٹا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ سیماء کے غائب ہونے کا سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ بھی اسی سازش کی ایک کڑی ہے جس کا کھوج لگانے کی میں کوشش کر رہا تھا۔
سیماء کا کمرہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر بستر کی حالت بتا رہی تھی کہ اس پر کوئی لیٹا تھا۔ بیڈ کے نیچے چیلوں کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ سیماء اپنی مرضی سے نہیں گئی ہے بلکہ شاید وہ اپنے پیروں پر بھی نہیں گئی تھی۔
بستر کے سرہانے ایک دھبہ سا نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی مائع چیز گری تھی جو اپنا داغ چھوڑ گئی۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا تو وہ خشک تھا۔ مگر سوچنے پر اس میں سے کلوروفارم کی تیز مک آئی۔ شاید اسے کلوروفارم سوکھا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔
یہاں پر بھی اغوا کرنے والوں نے کھڑکی ہی استعمال کی تھی۔

کتابوں کی قیمتیں اور ڈاک خرچ موجود ہیں۔ ان میں کسی بھی وقت تبدیلی ہو سکتی ہیں

حمید الرحمن کی ہدایت پر وحید پبلز کی خانہ تلاشی کا عمل ایک بار پھر شروع ہو گیا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔

کچھ دیر بعد ایک ایس ایچ او مع اپنے عملے کے آگیا۔ وہ یہ سن کر دنگ رہ گیا کہ اس کے آتے آتے مغویان میں ایک عدد کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے آتے ہی کرید کرید کر حمید الرحمن سے تفصیلات پوچھنی شروع کر دیں۔ پھر اس نے واحد اور سیما کے بیڈ روم کا بغور معائنہ کیا اور اپنے عملے کو وہاں سے فنگر پرنٹ اٹھانے کی ہدایت کی۔ اس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ مجرموں نے دونوں کو کھڑکی کے راستے اغوا کیا تھا۔ مگر وہ اس بات کی کوئی توجیح نہ پیش کر سکا کہ مجرم ان دونوں کو پبلز سے باہر کیسے لے گئے۔ پبلز سے باہر جانے کے لیے مین گیٹ کے علاوہ بھی دو راستے تھے مگر وہ مقفل رہتے تھے اور اب بھی ان پر تالے موجود تھے۔ مرکزی گیٹ پر موجود چوکیدار کے مطابق پچھلے تین گھنٹوں کے دوران نہ تو کوئی اس گیٹ سے آیا اور نہ ہی باہر گیا۔ پبلز کے چاروں طرف تقریباً دس فٹ اونچی دیوار تھی جس پر مزید تین فٹ کی ایک لوہے کے خاردار تاروں والی باڑھ تھی جس میں ہمہ وقت کرنٹ دوڑتا رہتا تھا۔ معاینے کے بعد یہ باڑھ بھی درست پائی گئی۔ یعنی مجرموں نے آمدورفت کے لیے یہ راستہ بھی استعمال نہیں کیا تھا۔

ایس ایچ او معاینے سے فارغ ہو کر ایک کمرے میں باری باری پبلز کے مینوں سے بیان لینے لگا۔ پہلے ملازموں کی باری آئی پھر اہل خانہ سے بیان لیے گئے آخر میں میزبان آیا۔

انسپکٹر عمر دراز ایک نسبتاً نوجوان افسر تھا مگر اس کے چہرے پر پولیس والوں کا پکا پن موجود تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے ہے۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا اور یہاں اپنی موجودگی کا سبب بیان کیا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔

”اوہ! تو یہ معاملہ بھی ہے۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا ”ویسے یہ کارروائی کب تک سرانجام دی جانی تھی؟“ اس کا اشارہ وصیت کے مطابق اثاثوں کی سیما کے نام منتقلی کا تھا۔

”ویسے تو ان اثاثوں کی منتقلی میں قانونی کارروائی میں خاصا وقت لگتا ہے۔ مگر قانونی طور پر مس سیما دو روز بعد مسٹر وحید الرحمن کے تمام اثاثوں کی مالک قرار پائیں۔“ یہ سن کر اس کی مسکراہٹ میں مزید گہرائی آگئی۔

”آپ سے تو ایک تفصیلی ملاقات کرنا پڑے گی۔ کیا آپ کل کسی وقت مجھ سے تھانے میں مل سکتے ہیں؟“ اس نے دریافت کیا۔ میں نے سوچ کر جواب دیا ”میرا خیال ہے کہ کل مجھے کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔ میں تھانے حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس کے بعد اس نے میرا بیان لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر والوں کو تسلی دے کر اور مجرموں کو جلد ہی پکڑ لینے کے دیوانہ دعوے کے ساتھ وحید پبلز سے رخصت ہو گیا مگر اس کے ماتحت وہیں ڈیرا ڈالے ہوئے

تھے۔ میں اپنے کمرے میں آگیا مگر نیند غائب ہو چکی تھی۔ چنانچہ ٹپکتے ہوئے میں اب تک حاصل ہونے والی معلومات اور واقعات کی کڑیاں آپس میں ملانے لگا۔ لیکن گھنٹے بھر کی دماغ سوزی کے بعد بھی یہ کڑیاں آپس میں فٹ نہ بیٹھیں۔ اس انتہائی الجھے ہوئے مسئلے نے مجھے چکرا دیا تھا بلکہ اس وقت تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سارے معاملے پر لعنت بھیج کر اپنا سامان سمیٹوں اور یہاں سے بھاگ نکلوں۔ مگر پھر سیما کے خیال نے مجھے باز رکھا۔ نہ جانے اسے کون اغوا کر کے لے گیا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا۔ جب سوچ سوچ کر سر میں درد ہونے لگا تو وہ سلیم کی دو گولیاں حلق سے اتار کر میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔



میں پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر عمر دراز کے سامنے بیٹھا ہوا اس سے کیس کے متعلق اس کا نقطہ نظر سن رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ گھر کے تقریباً درجن بھر ملازموں اور اہل خانہ اور محافظوں کی موجودگی میں کچھ لوگ گھر میں داخل ہوتے ہیں اور دو افراد کو اتنی خاموشی سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ سب سے اہم بات یہ کہ آخر وہ اندر آئے کیسے اور باہر گئے کس طرح۔ اگرچہ ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے مگر صرف اس صورت میں جب اندر کا کوئی فرد مجرموں سے ملا ہوا ہو۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ گھر کا کوئی فرد؟“

”آل۔۔۔ ہاں نتائج اخذ کرنے میں جلدی مت کریں۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولا ”اگرچہ یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ اس سارے چکر کے پس پشت دولت کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ معاملہ اگر کسی اور ہی نوعیت کا ہوتا تو واحد بھی غائب نہ ہوتا مگر مجرموں کے تعین میں جلد بازی سے پرہیز بہتر رہے گا۔“

”ایسا کرنے کی صورت میں انہیں ڈھیل نہیں ملے گی؟ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ”کل آپ نے یقیناً نوٹ کیا ہوگا کہ واحد کے بستر پر پڑا خون جم چکا تھا۔ یعنی وہ فائر ہونے سے پہلے وہاں پڑا تھا۔ دوسرے مس سیما کی کھڑکی کے نیچے بنے ہوئے پیروں کے نشانات میں ایک نسوانی پاؤں کا نشان بھی شامل تھا۔ وہ نشان بغیر چپل کا تھا۔“

”وکیل صاحب‘ میں نے سب نوٹ کیا ہے مگر میں پھر کہوں گا کہ ہمیں نتائج اخذ کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ مس سیما کی زندگی خطرے میں ہے۔ اگر وہ مجرموں کے ساتھ ملی ہوئی بھی ہے۔ تب بھی اس کا وجود ان کے لیے خطرے کا باعث ہے“ میرا لہجہ تیز ہو گیا۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ انسپکٹر نے دلچسپی سے کہا۔

تب میں نے اسے اب تک کی تمام رام کہانی سنائی شروع کر دی۔ والد صاحب کے خفیہ اکاؤنٹ اور فائل میں گزشتہ دو سال

میں اپنے آفس فون کر کے مس شیخ کو کچھ کام سوچنے اور انہیں جلد سے جلد انجام دینے کی ہدایت کی۔

○☆☆○

جنرل فیجر عابد حسین نے بڑی خوش خلقی سے میرا استقبال کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں مس سیماکو کیل ہوں۔ وہ سیماکے غائب ہونے پر از حد پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ پولیس سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی ہے۔

”میں نے دراصل آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ مس سیماکے متعلق کچھ معلومات درکار ہیں۔“

”ضرور مجھے آپ سے تعاون کر کے خوشی ہوگی“ وہ پُر خلوص لہجے میں بولا۔

”آپ نے مس سیماکو اس بار نور گڑھ آنے سے پہلے کب دیکھا تھا؟“

”غالباً جب وہ تین سال کی تھیں“ اس نے سوچتے ہوئے کہا ”وحید الرحمن نے ان کی سالگرہ منائی تھی، وہیں میں نے انہیں اب سے پہلے آخری مرتبہ دیکھا تھا“ اس نے مجھے حیران کر دیا۔

”یعنی اب سے پہلے آپ نے مس سیماکو دیکھا ہی نہیں! جب کہ وہ اس دوران میں تین چار بار نور گڑھ آچکی ہیں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”دراصل وہ جب بھی نور گڑھ آئیں تو کوئی نہ کوئی ایسا اتفاق ہو گیا کہ میں ان سے مل نہ سکا۔ حتیٰ کہ اب بھی جب انہیں آئے

کی رپورٹ کی غیر موجودگی سے لے کر نور گڑھ تک آتے ہوئے خود پر ہونے والے حملوں اور حمید الرحمن پر اپنے شک تک تمام سرگزشت سنا دی۔ وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔

”مس سیماسے آخری بار آپ کی ملاقات کب ہوئی تھی؟“

اس نے پوچھا اور میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اسے کل شام پہاڑی پر ہونے والی ملاقات سن کر کے سنا دی، وہ ہنسا۔

”اوہ تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ تب تو آپ کو زیادہ صدمہ پہنچا ہوگا۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ مس سیماکے پندرہ سالوں میں صرف چار بار نور گڑھ آئی تھیں۔ آخری بار وہ تین سال پہلے آئی تھیں“ آخری جملے پر اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔

”یعنی جب میرے والد بھی آخری بار نور گڑھ آئے تھے“ میں چونک اٹھا ”یہ مشابہت اپنے اندر کچھ معنی نہیں رکھتی۔“

”بالکل یہی بات میں بھی کہنا چاہ رہا ہوں۔“ عمر دراز نے میز پر ہاتھ مارا۔ اس کی بات نے مجھے کسی حد تک مضطرب کر دیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اب اجازت چاہوں گا! مجھے امید ہے کہ آپ جلد ہی اس معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔“

”میری پوری کوشش ہوگی“ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا پھر بولا ”ایک معاملے کی وضاحت کرتے جائیں کہ اگر کل تک مس سیماکا سراغ نہ ملا تو کیا تب بھی جائداد اور بزنس ان کے نام منتقل ہو سکتے ہیں۔“

”نہیں“ میں نے نفی میں سر ہلایا ”ان کے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہے۔“

”اور فرض کیا جائے کہ انوائٹنڈ گان ان کو زندہ نہ چھوڑیں تب؟“ اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”اس صورت میں مسٹر حمید الرحمن وراثت کے حق دار قرار پائیں گے۔“ میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔

یہی بات میرے ذہن میں بھی تھی کہ اگر سیماکے غائب ہونے سے کسی کو فائدہ ہو سکتا تھا تو وہ صرف حمید الرحمن تھا مگر سیماکے ساتھ حمید الرحمن کا بیٹا بھی غائب تھا اور یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی۔

تھانے سے واپسی پر کچھ نئے خیالات میرے دماغ میں زیر گردش تھے۔ خاص طور پر والد صاحب اور سیماکے تین سال پہلے والے آخری مرتبہ نور گڑھ آنے کے اتفاق نے اور پھر والد صاحب کے دوبارہ نور گڑھ نہ جانے میں پوشیدہ رموز نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب مجھے ایک ایسے شخص سے ملنا تھا جو سیماکو بچپن سے جانتا ہو۔ ایسا شخص میری نظر میں تھا بھی۔ یہ وحید کارپوریشن کا جنرل فیجر عابد حسین تھا۔ وہ وحید الرحمن کے دوستوں میں سے تھا اور اس کے وحید الرحمن سے گھریلو نوعیت کے تعلقات تھے مگر اس کے پاس جانے سے پہلے میں نے ایک پی سی او سے شہر

اچھی چیز مناسب دام
سب کے لبوں پر اس کا نام
اجتمع ملیو سيات کامرکز
(ہر عمر کے بچوں کے لئے)

اس کے علاوہ

BB بی۔ بیلے اور Triumph INTERNATIONAL

کے بریزیتیر بھی دستیاب ہیں

العزیز چلڈرن ویئر

ایک نام جو آپ بھلا نہیں سکیں گے

نزد شفاء اللہ طارق روڈ کراچی

ہوئے تین ماہ سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ میں صرف ایک بار ان سے مل پایا ہوں جب انہوں نے دفتر کا دورہ کیا تھا۔
”شکریہ!“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے جوابات سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی مگر فی الوقت کوئی اور ایسا شخص مجھے نظر نہیں آ رہا تھا جو سیمہ کے بارے میں مزید کچھ بتا سکتا۔ اب نہ معلوم یہ حمید الرحمن کی کون سی حکمت عملی تھی کہ اس نے سیمہ کو نور گڑھ سے ایسا دور رکھا کہ یہاں اس کے انتہائی قریبی لوگ بھی اس سے بے خبر رہے۔ اس سلسلے میں وحید پلس کے ملازمین بھی میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کی اکثریت پلس میں نئی تھی۔ یعنی وہ سیمہ کے تین سال قبل پلس میں آنے کے بعد ہی ملازم رکھے گئے تھے۔ یہ بات مجھے باتونی ملازم رشید نے بتائی تھی۔

وحید پلس کی طرف جاتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس شخص کی تلاش میں میں ادھر ادھر پھر رہا تھا وہاں پر میرا منتظر ہو گا۔ کارپورچ میں کھڑی کر کے میں اندر کی طرف بڑھا تو پلس کے برآمدے میں ایک بوڑھا شخص حمید الرحمن کے سامنے عاجزی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر وہیں چلا آیا، بوڑھا شخص باقاعدہ گڑ گڑا رہا تھا۔ ”صاحب“ میں نے دس سال آپ کی خدمت کی ہے، مجھے صرف پانچ سو روپے دے دیں۔ میں

آپ کو دعائیں دوں گا۔ صاحب میرا پوتا بہت بیمار ہے۔
”ٹھیک ہے تم دس سال یہاں نوکر رہے مگر اس کی تمہیں تنخواہ مل جاتی تھی۔ اب کون سا قرض باقی ہے جو میں ادا کروں؟“
حمید الرحمن تلخ لہجے میں بولا۔

”صاحب میں تو قرضہ مانگ رہا ہوں۔ صرف پانچ سو روپے؟“
بوڑھا دل شکستگی سے کہہ رہا تھا ”جلد واپس کر دوں گا۔“
”میں نے کوئی بینک نہیں کھول رکھا کہ قرض دوں“ وہ بے مروتی سے بولا۔ پھر اس نے چوکیدار کو آواز دے کر کہا ”اسے باہر نکالو! نہ جانے کہاں سے منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔“

چوکیدار نے آکر اس کا بازو پکڑا اور اسے مرکزی گیٹ کی طرف لے گیا۔ حمید الرحمن مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”ایک تو ہم ویسے ہی پریشان ہیں، اوپر سے یہ لوگ تنگ کرنے آ جاتے ہیں۔“

میں نے سہلا کر اس کی تائید کی۔ اب میں بوڑھے کے پیچھے جانے کی سوچ رہا تھا مگر اس طرح کہ حمید الرحمن نہ دیکھ پائے۔ خوش قسمتی سے وہ اندر چلا گیا اور میں فوراً اپنی کار کی طرف لپکا۔ بوڑھا ابھی پلس کی طرف آنے والی سڑک پر تھا۔ وہ شاید رو رہا تھا کیونکہ ہاتھ سے آنسو صاف کرتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں ایک لمحے کے لیے حمید الرحمن جیسے لوگوں کے لیے شدید نفرت نے جنم لیا۔ وہ بوڑھا یقیناً انتہائی مجبور ہو کر اس کے پاس آیا تھا مگر اس نے تنگ دلی سے اسے دھکا دیا۔

کار میں نے بوڑھے کے قریب روکنے کے بجائے ذرا آگے ایک موڑ پر روک دی۔ جہاں سے پلس سے دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا تھکے تھکے قدموں سے میری کار کے قریب سے گزرنے لگا۔ میں نے اسے آواز دی۔ وہ واپس آیا اور کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولا ”جی صاحب“ آپ نے مجھے آواز دی؟ اوہ! وہ چونک اٹھا ”میں نے آپ کو صاحب کے ساتھ دیکھا تھا“ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

میں نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا ”کار میں آ جاؤ بابا، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“
”کار میں؟“ وہ کچھ ہچکچاہٹ سے بولا ”نہیں صاحب، یہیں بات کر لیں۔“

”بات یہاں کرنے کی نہیں ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا ”میں تم سے وحید الرحمن صاحب کی بیٹی سیمہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں“ وہ میرے زور دینے پر کار میں بیٹھ گیا مگر تعجب سے بولا۔
”میں سیمہ بی بی کے بارے میں کیا بتا سکوں گا جبکہ آپ وہیں تو رہتے ہیں۔“

اس کے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے موقع ملتے ہی اُتر بھاگے گا۔ کار میں نے اوسط درجے کے ایک ہوٹل کے سامنے لے جا کر روک دی۔ ہوٹل میں نچلے طبقے کے لوگ دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد تھکن اتارنے کے لیے یار دوستوں سے گپ بازی میں مصروف تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہوٹل میں لرزہ خیز آواز والے ڈیک پر ایک چیخا ہوا گانا چل رہا تھا۔ یوں ہماری گفتگو کسی اور کے کانوں تک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اسے لیے ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ میرا حلیہ دیکھ کر فوراً ہی ایک بھرانازل ہو گیا ورنہ وہاں پر لوگوں کو کاؤنٹر پر جا کر آرڈر دینا پڑتا تھا۔ میں نے چائے اور بسکٹ منگائے۔

”میں وکیل ہوں۔ میرا نام ساجد ملک ہے۔“ میں نے بوڑھے سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا ”میں اصل میں سیمہ بی بی کا وکیل ہوں اور ان کی جائیداد اور کاروبار ان کے نام کرانے آیا ہوں مگر سیمہ بی بی کو کل رات اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”سیمہ بی بی کو!“ بوڑھے کی آنکھیں پھیل گئیں یعنی یہ خبر ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔
”میں سیمہ کے ساتھ ان کا چچا زاد واحد الرحمن بھی غائب ہے۔“
”وہی بد معاش بی بی کو اغوا کر کے لے گیا ہو گا“ بوڑھے نے اپنا خیال ظاہر کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔
”بظاہر تو ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”صاحب، میں نے اس گھر میں دس سال نوکری کی ہے۔“

چھپائی تھی مگر میں نے اتفاق سے سن لی تھی۔ بی بی کو اسپتال لے گئے تھے۔ پھر وہ صحیح ہو کر وہیں سے اسکول واپس چلی گئی تھیں۔
”تمہیں کس نے بتایا؟“ میں نے بغور اسے دیکھا ”اور یہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟“

”حمید صاحب نے بتایا تھا۔ حادثے میں ایک ٹرک ان کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔“

”انہیں کس اسپتال میں لے جایا گیا تھا؟“
”صاحب میں نے صحیح سے سنا نہیں تھا“ وہ اپنی یادداشت پر زور دیتا ہوا بولا ”مگر شاید خابان جیسا نام تھا، مجھے تو یہی یاد ہے۔“
”خابان بھلا کیا نام ہوا“ میں نے مایوسی سے کہا ”خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ سیما بی بی کا حلیہ کیا تھا؟“

”حلیہ!“ وہ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔
”حلیے سے مراد یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں کیسی لگتی تھیں۔ بالوں کی رنگت، آنکھیں اور جلد کی رنگت وغیرہ کیسی تھی؟“ میں نے اسے سمجھایا۔

”صاحب ان کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے۔ آنکھیں بھی اسی رنگ کی تھیں۔ وہ خود سرخ و سفید تھیں مگر قد کا کیا بتاؤں، وہ اس وقت تیرہ سال کی تھیں جب آخری بار میں نے انہیں دیکھا تھا“ وہ بڑی حد تک سیما کا حلیہ بیان کر رہا تھا۔ میں نے اسے مزید کرایا مگر کوئی اور کام کی بات نہ معلوم کر سکا۔ اٹھنے سے پہلے میں نے اسے پانچ سو روپے دیئے تو اس کی آنکھیں شدت جذبات سے

بوڑھے نے ایک گرمی سانس لے کر کہا ”میں حمید الرحمن اور ان کی اولاد کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ جب تک وحید صاحب زندہ تھے۔ یہ لوگ ان کی خوشامدوں میں لگے رہتے تھے مگر ان کے مرتے ہی ہر چیز کے مالک بن بیٹھے“ اس کے لہجے میں نفرت تھی۔
”معاف کرنا بابائیں نے تمہارا نام نہیں پوچھا۔“

”غریب کا کیا نام ہو گا صاحب!“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا ”ویسے مجھے عبدالکریم کہتے ہیں۔“

”اپنے لہجے سے تم بڑھے لکھے لگتے ہو۔“
”کہاں پڑھا صاحب۔ جو تھی سے اٹھا کر باپ نے مزدوری پر لگا دیا تھا۔ یہ تو بڑے گھروں میں کام کرتے کرتے بولنا آ گیا ہے۔“
اتنے میں بھرا چائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا ”وحید الرحمن کیسے شخص تھے؟“
”فرشتہ آدمی تھے۔ اپنے بھائی سے بالکل مختلف“ دوسرے لفظوں میں اس نے حمید الرحمن کو شیطان قرار دیا تھا ”ہم غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے مگر اللہ بھی اچھے لوگوں کو جلدی اپنے پاس بلا لیتا ہے۔“ کریم نے آہ بھری۔

”وحید صاحب کا انتقال کیسے ہوا تھا؟“
”ان کی گاڑی کھائی میں گر گئی تھی“ بوڑھے نے سادہ انداز میں کہا اور میں دم بخود رہ گیا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وحید الرحمن غیر طبعی موت کا شکار ہوا ہو گا ”وہ تو جی، سیما بی بی کو اللہ نے بچایا“ اس نے ایک بار پھر مجھے دنگ رہ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ مس سیما بھی وحید صاحب کے ساتھ گاڑی میں تھیں؟“

”جی صاحب! وحید صاحب نے انہیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ انہیں معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔“

میں نے چشم تصور میں وحید الرحمن کی گاڑی کو کھائی میں گرتے اور تین سالہ بچی کو گاڑی سے باہر گرتے دیکھا۔ کیا یہ بھی کسی سازش کا نتیجہ تھا، میں نے سوچا پھر چونک کر کریم سے پوچھا۔
”کریم! جب تین سال پہلے سیما بی بی شہر سے یہاں آئی تھیں تو تم وحید بیس میں کام کرتے تھے؟“

”جی صاحب، میں اس وقت وہیں تھا۔ ایک سال پہلے حمید صاحب نے بغیر کسی وجہ کے مجھے نکال دیا۔“

”تم نے سیما بی بی کو دیکھا تھا۔“

”نہیں صاحب! گھر آتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“

”مس سیما کا“ میں نے بے یقینی سے کہا۔ آج شاید میرے حیران ہونے کا دن تھا۔

”بی بی کے آنے کی خبر سن کر ہم سب بہت خوش تھے۔ اچانک ان کے حادثے کی خبر آگئی۔ حمید صاحب نے یہ بات سب سے

اردو کے قدیمی ادب کا ایک نیا نسخہ

ملن و مزاج سے بھرپور فکری تحفے کے لیے رومان ناول
آپ کے جاننے والے مشہور ادیب اشرف مہمانی کے قلم سے

قسطیں ایک ہی قیمت پر

گنگا کی مہر قیمت: ۲۰ روپے	حلیہ نیکی قیمت: ۲۰ روپے	ابھی بھر قیمت: ۲۰ روپے
پتھر کی موت قیمت: ۲۰ روپے	شرارت قیمت: ۲۰ روپے	بی بی کی تان قیمت: ۲۰ روپے
مشرقی لڑکی قیمت: ۲۰ روپے	الو کی گم قیمت: ۲۰ روپے	اور سی قیمت: ۲۰ روپے
مشرقی لڑکی قیمت: ۲۰ روپے	پتھر کی موت قیمت: ۲۰ روپے	ابھی بھر قیمت: ۲۰ روپے

پورے ناچھوڑی، مسکرا سیکھیں

تمام کتابیں ایک ہی قیمت پر

۱۹۷۴ء کی کتاب ۲۴ روپے، ۱۹۷۵ء کی کتاب ۲۵ روپے، ۱۹۷۶ء کی کتاب ۲۶ روپے، ۱۹۷۷ء کی کتاب ۲۷ روپے، ۱۹۷۸ء کی کتاب ۲۸ روپے، ۱۹۷۹ء کی کتاب ۲۹ روپے، ۱۹۸۰ء کی کتاب ۳۰ روپے، ۱۹۸۱ء کی کتاب ۳۱ روپے، ۱۹۸۲ء کی کتاب ۳۲ روپے، ۱۹۸۳ء کی کتاب ۳۳ روپے، ۱۹۸۴ء کی کتاب ۳۴ روپے، ۱۹۸۵ء کی کتاب ۳۵ روپے، ۱۹۸۶ء کی کتاب ۳۶ روپے، ۱۹۸۷ء کی کتاب ۳۷ روپے، ۱۹۸۸ء کی کتاب ۳۸ روپے، ۱۹۸۹ء کی کتاب ۳۹ روپے، ۱۹۹۰ء کی کتاب ۴۰ روپے، ۱۹۹۱ء کی کتاب ۴۱ روپے، ۱۹۹۲ء کی کتاب ۴۲ روپے، ۱۹۹۳ء کی کتاب ۴۳ روپے، ۱۹۹۴ء کی کتاب ۴۴ روپے، ۱۹۹۵ء کی کتاب ۴۵ روپے، ۱۹۹۶ء کی کتاب ۴۶ روپے، ۱۹۹۷ء کی کتاب ۴۷ روپے، ۱۹۹۸ء کی کتاب ۴۸ روپے، ۱۹۹۹ء کی کتاب ۴۹ روپے، ۲۰۰۰ء کی کتاب ۵۰ روپے، ۲۰۰۱ء کی کتاب ۵۱ روپے، ۲۰۰۲ء کی کتاب ۵۲ روپے، ۲۰۰۳ء کی کتاب ۵۳ روپے، ۲۰۰۴ء کی کتاب ۵۴ روپے، ۲۰۰۵ء کی کتاب ۵۵ روپے، ۲۰۰۶ء کی کتاب ۵۶ روپے، ۲۰۰۷ء کی کتاب ۵۷ روپے، ۲۰۰۸ء کی کتاب ۵۸ روپے، ۲۰۰۹ء کی کتاب ۵۹ روپے، ۲۰۱۰ء کی کتاب ۶۰ روپے، ۲۰۱۱ء کی کتاب ۶۱ روپے، ۲۰۱۲ء کی کتاب ۶۲ روپے، ۲۰۱۳ء کی کتاب ۶۳ روپے، ۲۰۱۴ء کی کتاب ۶۴ روپے، ۲۰۱۵ء کی کتاب ۶۵ روپے، ۲۰۱۶ء کی کتاب ۶۶ روپے، ۲۰۱۷ء کی کتاب ۶۷ روپے، ۲۰۱۸ء کی کتاب ۶۸ روپے، ۲۰۱۹ء کی کتاب ۶۹ روپے، ۲۰۲۰ء کی کتاب ۷۰ روپے، ۲۰۲۱ء کی کتاب ۷۱ روپے، ۲۰۲۲ء کی کتاب ۷۲ روپے، ۲۰۲۳ء کی کتاب ۷۳ روپے، ۲۰۲۴ء کی کتاب ۷۴ روپے، ۲۰۲۵ء کی کتاب ۷۵ روپے، ۲۰۲۶ء کی کتاب ۷۶ روپے، ۲۰۲۷ء کی کتاب ۷۷ روپے، ۲۰۲۸ء کی کتاب ۷۸ روپے، ۲۰۲۹ء کی کتاب ۷۹ روپے، ۲۰۳۰ء کی کتاب ۸۰ روپے، ۲۰۳۱ء کی کتاب ۸۱ روپے، ۲۰۳۲ء کی کتاب ۸۲ روپے، ۲۰۳۳ء کی کتاب ۸۳ روپے، ۲۰۳۴ء کی کتاب ۸۴ روپے، ۲۰۳۵ء کی کتاب ۸۵ روپے، ۲۰۳۶ء کی کتاب ۸۶ روپے، ۲۰۳۷ء کی کتاب ۸۷ روپے، ۲۰۳۸ء کی کتاب ۸۸ روپے، ۲۰۳۹ء کی کتاب ۸۹ روپے، ۲۰۴۰ء کی کتاب ۹۰ روپے، ۲۰۴۱ء کی کتاب ۹۱ روپے، ۲۰۴۲ء کی کتاب ۹۲ روپے، ۲۰۴۳ء کی کتاب ۹۳ روپے، ۲۰۴۴ء کی کتاب ۹۴ روپے، ۲۰۴۵ء کی کتاب ۹۵ روپے، ۲۰۴۶ء کی کتاب ۹۶ روپے، ۲۰۴۷ء کی کتاب ۹۷ روپے، ۲۰۴۸ء کی کتاب ۹۸ روپے، ۲۰۴۹ء کی کتاب ۹۹ روپے، ۲۰۵۰ء کی کتاب ۱۰۰ روپے، ۲۰۵۱ء کی کتاب ۱۰۱ روپے، ۲۰۵۲ء کی کتاب ۱۰۲ روپے، ۲۰۵۳ء کی کتاب ۱۰۳ روپے، ۲۰۵۴ء کی کتاب ۱۰۴ روپے، ۲۰۵۵ء کی کتاب ۱۰۵ روپے، ۲۰۵۶ء کی کتاب ۱۰۶ روپے، ۲۰۵۷ء کی کتاب ۱۰۷ روپے، ۲۰۵۸ء کی کتاب ۱۰۸ روپے، ۲۰۵۹ء کی کتاب ۱۰۹ روپے، ۲۰۶۰ء کی کتاب ۱۱۰ روپے، ۲۰۶۱ء کی کتاب ۱۱۱ روپے، ۲۰۶۲ء کی کتاب ۱۱۲ روپے، ۲۰۶۳ء کی کتاب ۱۱۳ روپے، ۲۰۶۴ء کی کتاب ۱۱۴ روپے، ۲۰۶۵ء کی کتاب ۱۱۵ روپے، ۲۰۶۶ء کی کتاب ۱۱۶ روپے، ۲۰۶۷ء کی کتاب ۱۱۷ روپے، ۲۰۶۸ء کی کتاب ۱۱۸ روپے، ۲۰۶۹ء کی کتاب ۱۱۹ روپے، ۲۰۷۰ء کی کتاب ۱۲۰ روپے، ۲۰۷۱ء کی کتاب ۱۲۱ روپے، ۲۰۷۲ء کی کتاب ۱۲۲ روپے، ۲۰۷۳ء کی کتاب ۱۲۳ روپے، ۲۰۷۴ء کی کتاب ۱۲۴ روپے، ۲۰۷۵ء کی کتاب ۱۲۵ روپے، ۲۰۷۶ء کی کتاب ۱۲۶ روپے، ۲۰۷۷ء کی کتاب ۱۲۷ روپے، ۲۰۷۸ء کی کتاب ۱۲۸ روپے، ۲۰۷۹ء کی کتاب ۱۲۹ روپے، ۲۰۸۰ء کی کتاب ۱۳۰ روپے، ۲۰۸۱ء کی کتاب ۱۳۱ روپے، ۲۰۸۲ء کی کتاب ۱۳۲ روپے، ۲۰۸۳ء کی کتاب ۱۳۳ روپے، ۲۰۸۴ء کی کتاب ۱۳۴ روپے، ۲۰۸۵ء کی کتاب ۱۳۵ روپے، ۲۰۸۶ء کی کتاب ۱۳۶ روپے، ۲۰۸۷ء کی کتاب ۱۳۷ روپے، ۲۰۸۸ء کی کتاب ۱۳۸ روپے، ۲۰۸۹ء کی کتاب ۱۳۹ روپے، ۲۰۹۰ء کی کتاب ۱۴۰ روپے، ۲۰۹۱ء کی کتاب ۱۴۱ روپے، ۲۰۹۲ء کی کتاب ۱۴۲ روپے، ۲۰۹۳ء کی کتاب ۱۴۳ روپے، ۲۰۹۴ء کی کتاب ۱۴۴ روپے، ۲۰۹۵ء کی کتاب ۱۴۵ روپے، ۲۰۹۶ء کی کتاب ۱۴۶ روپے، ۲۰۹۷ء کی کتاب ۱۴۷ روپے، ۲۰۹۸ء کی کتاب ۱۴۸ روپے، ۲۰۹۹ء کی کتاب ۱۴۹ روپے، ۲۰۱۰ء کی کتاب ۱۵۰ روپے، ۲۰۱۱ء کی کتاب ۱۵۱ روپے، ۲۰۱۲ء کی کتاب ۱۵۲ روپے، ۲۰۱۳ء کی کتاب ۱۵۳ روپے، ۲۰۱۴ء کی کتاب ۱۵۴ روپے، ۲۰۱۵ء کی کتاب ۱۵۵ روپے، ۲۰۱۶ء کی کتاب ۱۵۶ روپے، ۲۰۱۷ء کی کتاب ۱۵۷ روپے، ۲۰۱۸ء کی کتاب ۱۵۸ روپے، ۲۰۱۹ء کی کتاب ۱۵۹ روپے، ۲۰۲۰ء کی کتاب ۱۶۰ روپے، ۲۰۲۱ء کی کتاب ۱۶۱ روپے، ۲۰۲۲ء کی کتاب ۱۶۲ روپے، ۲۰۲۳ء کی کتاب ۱۶۳ روپے، ۲۰۲۴ء کی کتاب ۱۶۴ روپے، ۲۰۲۵ء کی کتاب ۱۶۵ روپے، ۲۰۲۶ء کی کتاب ۱۶۶ روپے، ۲۰۲۷ء کی کتاب ۱۶۷ روپے، ۲۰۲۸ء کی کتاب ۱۶۸ روپے، ۲۰۲۹ء کی کتاب ۱۶۹ روپے، ۲۰۳۰ء کی کتاب ۱۷۰ روپے، ۲۰۳۱ء کی کتاب ۱۷۱ روپے، ۲۰۳۲ء کی کتاب ۱۷۲ روپے، ۲۰۳۳ء کی کتاب ۱۷۳ روپے، ۲۰۳۴ء کی کتاب ۱۷۴ روپے، ۲۰۳۵ء کی کتاب ۱۷۵ روپے، ۲۰۳۶ء کی کتاب ۱۷۶ روپے، ۲۰۳۷ء کی کتاب ۱۷۷ روپے، ۲۰۳۸ء کی کتاب ۱۷۸ روپے، ۲۰۳۹ء کی کتاب ۱۷۹ روپے، ۲۰۴۰ء کی کتاب ۱۸۰ روپے، ۲۰۴۱ء کی کتاب ۱۸۱ روپے، ۲۰۴۲ء کی کتاب ۱۸۲ روپے، ۲۰۴۳ء کی کتاب ۱۸۳ روپے، ۲۰۴۴ء کی کتاب ۱۸۴ روپے، ۲۰۴۵ء کی کتاب ۱۸۵ روپے، ۲۰۴۶ء کی کتاب ۱۸۶ روپے، ۲۰۴۷ء کی کتاب ۱۸۷ روپے، ۲۰۴۸ء کی کتاب ۱۸۸ روپے، ۲۰۴۹ء کی کتاب ۱۸۹ روپے، ۲۰۵۰ء کی کتاب ۱۹۰ روپے، ۲۰۵۱ء کی کتاب ۱۹۱ روپے، ۲۰۵۲ء کی کتاب ۱۹۲ روپے، ۲۰۵۳ء کی کتاب ۱۹۳ روپے، ۲۰۵۴ء کی کتاب ۱۹۴ روپے، ۲۰۵۵ء کی کتاب ۱۹۵ روپے، ۲۰۵۶ء کی کتاب ۱۹۶ روپے، ۲۰۵۷ء کی کتاب ۱۹۷ روپے، ۲۰۵۸ء کی کتاب ۱۹۸ روپے، ۲۰۵۹ء کی کتاب ۱۹۹ روپے، ۲۰۶۰ء کی کتاب ۲۰۰ روپے، ۲۰۶۱ء کی کتاب ۲۰۱ روپے، ۲۰۶۲ء کی کتاب ۲۰۲ روپے، ۲۰۶۳ء کی کتاب ۲۰۳ روپے، ۲۰۶۴ء کی کتاب ۲۰۴ روپے، ۲۰۶۵ء کی کتاب ۲۰۵ روپے، ۲۰۶۶ء کی کتاب ۲۰۶ روپے، ۲۰۶۷ء کی کتاب ۲۰۷ روپے، ۲۰۶۸ء کی کتاب ۲۰۸ روپے، ۲۰۶۹ء کی کتاب ۲۰۹ روپے، ۲۰۷۰ء کی کتاب ۲۱۰ روپے، ۲۰۷۱ء کی کتاب ۲۱۱ روپے، ۲۰۷۲ء کی کتاب ۲۱۲ روپے، ۲۰۷۳ء کی کتاب ۲۱۳ روپے، ۲۰۷۴ء کی کتاب ۲۱۴ روپے، ۲۰۷۵ء کی کتاب ۲۱۵ روپے، ۲۰۷۶ء کی کتاب ۲۱۶ روپے، ۲۰۷۷ء کی کتاب ۲۱۷ روپے، ۲۰۷۸ء کی کتاب ۲۱۸ روپے، ۲۰۷۹ء کی کتاب ۲۱۹ روپے، ۲۰۸۰ء کی کتاب ۲۲۰ روپے، ۲۰۸۱ء کی کتاب ۲۲۱ روپے، ۲۰۸۲ء کی کتاب ۲۲۲ روپے، ۲۰۸۳ء کی کتاب ۲۲۳ روپے، ۲۰۸۴ء کی کتاب ۲۲۴ روپے، ۲۰۸۵ء کی کتاب ۲۲۵ روپے، ۲۰۸۶ء کی کتاب ۲۲۶ روپے، ۲۰۸۷ء کی کتاب ۲۲۷ روپے، ۲۰۸۸ء کی کتاب ۲۲۸ روپے، ۲۰۸۹ء کی کتاب ۲۲۹ روپے، ۲۰۹۰ء کی کتاب ۲۳۰ روپے، ۲۰۹۱ء کی کتاب ۲۳۱ روپے، ۲۰۹۲ء کی کتاب ۲۳۲ روپے، ۲۰۹۳ء کی کتاب ۲۳۳ روپے، ۲۰۹۴ء کی کتاب ۲۳۴ روپے، ۲۰۹۵ء کی کتاب ۲۳۵ روپے، ۲۰۹۶ء کی کتاب ۲۳۶ روپے، ۲۰۹۷ء کی کتاب ۲۳۷ روپے، ۲۰۹۸ء کی کتاب ۲۳۸ روپے، ۲۰۹۹ء کی کتاب ۲۳۹ روپے، ۲۰۱۰ء کی کتاب ۲۴۰ روپے، ۲۰۱۱ء کی کتاب ۲۴۱ روپے، ۲۰۱۲ء کی کتاب ۲۴۲ روپے، ۲۰۱۳ء کی کتاب ۲۴۳ روپے، ۲۰۱۴ء کی کتاب ۲۴۴ روپے، ۲۰۱۵ء کی کتاب ۲۴۵ روپے، ۲۰۱۶ء کی کتاب ۲۴۶ روپے، ۲۰۱۷ء کی کتاب ۲۴۷ روپے، ۲۰۱۸ء کی کتاب ۲۴۸ روپے، ۲۰۱۹ء کی کتاب ۲۴۹ روپے، ۲۰۲۰ء کی کتاب ۲۵۰ روپے، ۲۰۲۱ء کی کتاب ۲۵۱ روپے، ۲۰۲۲ء کی کتاب ۲۵۲ روپے، ۲۰۲۳ء کی کتاب ۲۵۳ روپے، ۲۰۲۴ء کی کتاب ۲۵۴ روپے، ۲۰۲۵ء کی کتاب ۲۵۵ روپے، ۲۰۲۶ء کی کتاب ۲۵۶ روپے، ۲۰۲۷ء کی کتاب ۲۵۷ روپے، ۲۰۲۸ء کی کتاب ۲۵۸ روپے، ۲۰۲۹ء کی کتاب ۲۵۹ روپے، ۲۰۳۰ء کی کتاب ۲۶۰ روپے، ۲۰۳۱ء کی کتاب ۲۶۱ روپے، ۲۰۳۲ء کی کتاب ۲۶۲ روپے، ۲۰۳۳ء کی کتاب ۲۶۳ روپے، ۲۰۳۴ء کی کتاب ۲۶۴ روپے، ۲۰۳۵ء کی کتاب ۲۶۵ روپے، ۲۰۳۶ء کی کتاب ۲۶۶ روپے، ۲۰۳۷ء کی کتاب ۲۶۷ روپے، ۲۰۳۸ء کی کتاب ۲۶۸ روپے، ۲۰۳۹ء کی کتاب ۲۶۹ روپے، ۲۰۴۰ء کی کتاب ۲۷۰ روپے، ۲۰۴۱ء کی کتاب ۲۷۱ روپے، ۲۰۴۲ء کی کتاب ۲۷۲ روپے، ۲۰۴۳ء کی کتاب ۲۷۳ روپے، ۲۰۴۴ء کی کتاب ۲۷۴ روپے، ۲۰۴۵ء کی کتاب ۲۷۵ روپے، ۲۰۴۶ء کی کتاب ۲۷۶ روپے، ۲۰۴۷ء کی کتاب ۲۷۷ روپے، ۲۰۴۸ء کی کتاب ۲۷۸ روپے، ۲۰۴۹ء کی کتاب ۲۷۹ روپے، ۲۰۵۰ء کی کتاب ۲۸۰ روپے، ۲۰۵۱ء کی کتاب ۲۸۱ روپے، ۲۰۵۲ء کی کتاب ۲۸۲ روپے، ۲۰۵۳ء کی کتاب ۲۸۳ روپے، ۲۰۵۴ء کی کتاب ۲۸۴ روپے، ۲۰۵۵ء کی کتاب ۲۸۵ روپے، ۲۰۵۶ء کی کتاب ۲۸۶ روپے، ۲۰۵۷ء کی کتاب ۲۸۷ روپے، ۲۰۵۸ء کی کتاب ۲۸۸ روپے، ۲۰۵۹ء کی کتاب ۲۸۹ روپے، ۲۰۶۰ء کی کتاب ۲۹۰ روپے، ۲۰۶۱ء کی کتاب ۲۹۱ روپے، ۲۰۶۲ء کی کتاب ۲۹۲ روپے، ۲۰۶۳ء کی کتاب ۲۹۳ روپے، ۲۰۶۴ء کی کتاب ۲۹۴ روپے، ۲۰۶۵ء کی کتاب ۲۹۵ روپے، ۲۰۶۶ء کی کتاب ۲۹۶ روپے، ۲۰۶۷ء کی کتاب ۲۹۷ روپے، ۲۰۶۸ء کی کتاب ۲۹۸ روپے، ۲۰۶۹ء کی کتاب ۲۹۹ روپے، ۲۰۷۰ء کی کتاب ۳۰۰ روپے، ۲۰۷۱ء کی کتاب ۳۰۱ روپے، ۲۰۷۲ء کی کتاب ۳۰۲ روپے، ۲۰۷۳ء کی کتاب ۳۰۳ روپے، ۲۰۷۴ء کی کتاب ۳۰۴ روپے، ۲۰۷۵ء کی کتاب ۳۰۵ روپے، ۲۰۷۶ء کی کتاب ۳۰۶ روپے، ۲۰۷۷ء کی کتاب ۳۰۷ روپے، ۲۰۷۸ء کی کتاب ۳۰۸ روپے، ۲۰۷۹ء کی کتاب ۳۰۹ روپے، ۲۰۸۰ء کی کتاب ۳۱۰ روپے، ۲۰۸۱ء کی کتاب ۳۱۱ روپے، ۲۰۸۲ء کی کتاب ۳۱۲ روپے، ۲۰۸۳ء کی کتاب ۳۱۳ روپے، ۲۰۸۴ء کی کتاب ۳۱۴ روپے، ۲۰۸۵ء کی کتاب ۳۱۵ روپے، ۲۰۸۶ء کی کتاب ۳۱۶ روپے، ۲۰۸۷ء کی کتاب ۳۱۷ روپے، ۲۰۸۸ء کی کتاب ۳۱۸ روپے، ۲۰۸۹ء کی کتاب ۳۱۹ روپے، ۲۰۹۰ء کی کتاب ۳۲۰ روپے، ۲۰۹۱ء کی کتاب ۳۲۱ روپے، ۲۰۹۲ء کی کتاب ۳۲۲ روپے، ۲۰۹۳ء کی کتاب ۳۲۳ روپے، ۲۰۹۴ء کی کتاب ۳۲۴ روپے، ۲۰۹۵ء کی کتاب ۳۲۵ روپے، ۲۰۹۶ء کی کتاب ۳۲۶ روپے، ۲۰۹۷ء کی کتاب ۳۲۷ روپے، ۲۰۹۸ء کی کتاب ۳۲۸ روپے، ۲۰۹۹ء کی کتاب ۳۲۹ روپے، ۲۰۱۰ء کی کتاب ۳۳۰ روپے، ۲۰۱۱ء کی کتاب ۳۳۱ روپے، ۲۰۱۲ء کی کتاب ۳۳۲ روپے، ۲۰۱۳ء کی کتاب ۳۳۳ روپے، ۲۰۱۴ء کی کتاب ۳۳۴ روپے، ۲۰۱۵ء کی کتاب ۳۳۵ روپے، ۲۰۱۶ء کی کتاب ۳۳۶ روپے، ۲۰۱۷ء کی کتاب ۳۳۷ روپے، ۲۰۱۸ء کی کتاب ۳۳۸ روپے، ۲۰۱۹ء کی کتاب ۳۳۹ روپے، ۲۰۲۰ء کی کتاب ۳۴۰ روپے، ۲۰۲۱ء کی کتاب ۳۴۱ روپے، ۲۰۲۲ء کی کتاب ۳۴۲ روپے، ۲۰۲۳ء کی کتاب ۳۴۳ روپے، ۲۰۲۴ء کی کتاب ۳۴۴ روپے، ۲۰۲۵ء کی کتاب ۳۴۵ روپے، ۲۰۲۶ء کی کتاب ۳۴۶ روپے، ۲۰۲۷ء کی کتاب ۳۴۷ روپے، ۲۰۲۸ء کی کتاب ۳۴۸ روپے، ۲۰۲۹ء کی کتاب ۳۴۹ روپے، ۲۰۳۰ء کی کتاب ۳۵۰ روپے، ۲۰۳۱ء کی کتاب ۳۵۱ روپے، ۲۰۳۲ء کی کتاب ۳۵۲ روپے، ۲۰۳۳ء کی کتاب ۳۵۳ روپے، ۲۰۳۴ء کی کتاب ۳۵۴ روپے، ۲۰۳۵ء کی کتاب ۳۵۵ روپے، ۲۰۳۶ء کی کتاب ۳۵۶ روپے، ۲۰۳۷ء کی کتاب ۳۵۷ روپے، ۲۰۳۸ء کی کتاب ۳۵۸ روپے، ۲۰۳۹ء کی کتاب ۳۵۹ روپے، ۲۰۴۰ء کی کتاب ۳۶۰ روپے، ۲۰۴۱ء کی کتاب ۳۶۱ روپے، ۲۰۴۲ء کی کتاب ۳۶۲ روپے، ۲۰۴۳ء کی کتاب ۳۶۳ روپے، ۲۰۴۴ء کی کتاب ۳۶۴ روپے، ۲۰۴۵ء کی کتاب ۳۶۵ روپے، ۲۰۴۶ء کی کتاب ۳۶۶ روپے، ۲۰۴۷ء کی کتاب ۳۶۷ روپے، ۲۰۴۸ء کی کتاب ۳۶۸ روپے، ۲۰۴۹ء کی کتاب ۳۶۹ روپے، ۲۰۵۰ء کی کتاب ۳۷۰ روپے، ۲۰۵۱ء کی کتاب ۳۷۱ روپے، ۲۰۵۲ء کی کتاب ۳۷۲ روپے، ۲۰۵۳ء کی کتاب ۳۷۳ روپے، ۲۰۵۴ء کی کتاب ۳۷۴ روپے، ۲۰۵۵ء کی کتاب ۳۷۵ روپے، ۲۰۵۶ء کی کتاب ۳۷۶ روپے، ۲۰۵۷ء کی کتاب ۳۷۷ روپے، ۲۰۵۸ء کی کتاب ۳۷۸ روپے، ۲۰۵۹ء کی کتاب ۳۷۹ روپے، ۲۰۶۰ء کی کتاب ۳۸۰ روپے، ۲۰۶۱ء کی کتاب ۳۸۱ روپے، ۲۰۶۲ء کی کتاب ۳۸۲ روپے، ۲۰۶۳ء کی کتاب ۳۸۳ روپے، ۲۰۶۴ء کی کتاب ۳۸۴ روپے، ۲۰۶۵ء کی کتاب ۳۸۵ روپے، ۲۰۶۶ء کی کتاب ۳۸۶ روپے، ۲۰۶۷ء کی کتاب ۳۸۷ روپے، ۲۰۶۸ء کی کتاب ۳۸۸ روپے، ۲۰۶۹ء کی کتاب ۳۸۹ روپے، ۲۰۷۰ء کی کتاب ۳۹۰ روپے، ۲۰۷۱ء کی کتاب ۳۹۱ روپے، ۲۰۷۲ء کی کتاب ۳۹۲ روپے، ۲۰۷۳ء کی کتاب ۳۹۳ روپے، ۲۰۷۴ء کی کتاب ۳۹۴ روپے، ۲۰۷۵ء کی کتاب ۳۹۵ روپے، ۲۰۷۶ء کی کتاب ۳۹۶ روپے، ۲۰۷۷ء کی کتاب ۳۹۷ روپے، ۲۰۷۸ء کی کتاب ۳۹۸ روپے، ۲۰۷۹ء کی کتاب ۳۹۹ روپے، ۲۰۸۰ء کی کتاب ۴۰۰ روپے، ۲۰۸۱ء کی کتاب ۴۰۱ روپے، ۲۰۸۲ء کی کتاب ۴۰۲ روپے، ۲۰۸۳ء کی کتاب ۴۰۳ روپے، ۲۰۸۴ء کی کتاب ۴۰۴ روپے، ۲۰۸۵ء کی کتاب ۴۰۵ روپے، ۲۰۸۶ء کی کتاب ۴۰۶ روپے، ۲۰۸۷ء کی کتاب ۴۰۷ روپے، ۲۰۸۸ء کی کتاب ۴۰۸ روپے، ۲۰۸۹ء کی کتاب ۴۰۹ روپے، ۲۰۹۰ء کی کتاب ۴۱۰ روپے، ۲۰۹۱ء کی کتاب ۴۱۱ روپے، ۲۰۹۲ء کی کتاب ۴۱۲ روپے، ۲۰۹۳ء کی کتاب ۴۱۳ روپے، ۲۰۹۴ء کی کتاب ۴۱۴ روپے، ۲۰۹۵ء کی کتاب ۴۱۵ روپے، ۲۰۹۶ء کی کتاب ۴۱۶ روپے، ۲۰۹۷ء کی کتاب ۴۱۷ روپے، ۲۰۹۸ء کی کتاب ۴۱۸ روپے، ۲۰۹۹ء کی کتاب ۴۱۹ روپے، ۲۰۱۰ء کی کتاب ۴۲۰ روپے، ۲۰۱۱ء کی کتاب ۴۲۱ روپے، ۲۰۱۲ء کی کتاب ۴۲۲ روپے، ۲۰۱۳ء کی کتاب ۴۲۳ روپے، ۲۰۱۴ء کی کتاب ۴۲۴ روپے، ۲۰۱۵ء کی کتاب ۴۲۵ روپے، ۲۰۱۶ء کی کتاب ۴۲۶ روپے، ۲۰۱۷ء کی کتاب ۴۲۷ روپے، ۲۰۱۸ء کی کتاب ۴۲۸ روپے، ۲۰۱۹ء کی کتاب ۴۲۹ روپے، ۲۰۲۰ء کی کتاب ۴۳۰ روپے، ۲۰۲۱ء کی کتاب ۴۳۱ روپے، ۲۰۲۲ء کی کتاب ۴۳۲ روپے، ۲۰۲۳ء کی کتاب ۴۳۳ روپے، ۲۰۲۴ء کی کتاب ۴۳۴ روپے، ۲۰۲۵ء کی کتاب ۴۳۵ روپے، ۲۰۲۶ء کی کتاب ۴۳۶ روپے، ۲۰۲۷ء کی کتاب ۴۳۷ روپے، ۲۰۲۸ء کی کتاب ۴۳۸ روپے، ۲۰۲۹ء کی کتاب ۴۳۹ روپے، ۲۰۳۰ء کی کتاب ۴۴۰ روپے، ۲۰۳۱ء کی کتاب ۴۴۱ روپے، ۲۰۳۲ء کی کتاب ۴۴۲ روپے، ۲۰۳۳ء کی کتاب ۴۴۳ روپے، ۲۰۳۴ء کی کتاب ۴۴۴ روپے، ۲۰۳۵ء کی کتاب ۴۴۵ روپے، ۲۰۳۶ء کی کتاب ۴۴۶ روپے، ۲۰۳۷ء کی کتاب ۴۴۷ روپے، ۲۰۳۸ء کی کتاب ۴۴۸ روپے، ۲۰۳۹ء کی کتاب ۴۴۹ روپے، ۲۰۴۰ء کی کتاب ۴۵۰ روپے، ۲۰۴۱ء کی کتاب ۴۵۱ روپے، ۲۰۴۲ء کی کتاب ۴۵۲ روپے، ۲۰۴۳ء کی کتاب ۴۵۳ روپے، ۲۰۴۴ء کی کتاب

بھگ گئیں۔

مراد خیابان اسپتال سے ہے۔ یہ اسپتال نور گڑھ سے بیس میل دور نور گڑھ اور نیٹش ہائی وے کو ملانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ یہ علاقے کا سب سے بڑا اور جدید اسپتال ہے مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟

”کوئی بات نہیں ہے“ میں نے پُر خیال لہجے میں کہا ”تم سے میری ایک درخواست ہے کہ وحید کارپوریشن اور مسٹر وحید الرحمن کی جائیداد میں واقع ہر جگہ کی کڑی نگرانی کرو۔“

”اگر میں تم سے پوچھوں گا کہ کیوں؟ تو تم کہو گے کہ کوئی خاص بات نہیں ہے“ وہ مسکرا کر بولا۔

”نہیں“ میں یہ نہیں کہوں گا“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”بلکہ میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ....“ میں حمید الرحمن کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ آکر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ پھر گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

”مجرموں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے پولیس کو انفارم کر دیا ہے۔ اب انہوں نے اپنا مطالبہ بڑھا کر ایک کروڑ روپے کر دیا ہے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا“ انسپکٹر تشویش زدہ انداز میں بولا ”کیا آپ تین دن میں اتنی بڑی رقم کا انتظام کر سکیں گے۔“

”تقریباً ناممکن ہے“ وہ مایوسی سے بولا ”میں وحید کارپوریشن کا محض منیجر ڈائریکٹر ہوں اور اتنے اختیارات نہیں رکھتا کہ محض اپنی صوابدید پر اتنی بڑی رقم نکال سکوں۔ اس کے لیے مجھے تمام ڈائریکٹرز کی منظوری لینا ہوگی پھر بینک بھی اتنی جلدی اتنی بڑی رقم مہیا نہیں کر سکتا ہے۔ اسے اپنے ہیڈ آفس سے رقم منگوانی پڑے گی جس میں وقت لگے گا۔ اب بتائیے میں کیا کروں؟“

”سب سے پہلے تو ہمیں اغوا کنندگان سے مزید مہلت حاصل کرنا ہوگی“ میں نے کہا۔

”بہت مشکل ہے، وہ سخت طیش میں تھے۔ بہر حال مل پوری کوشش کروں گا کیونکہ یہ میرے بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔ انسپکٹر صاحب آپ سے میری درخواست ہے کہ آئندہ یہاں مت آئیے گا۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اب کوئی پولیس والا یہاں دکھائی دیا تو وہ بلا تاخیر ان دونوں کو قتل کر دیں گے۔“

”حمید صاحب، اگرچہ مجرم ایسی گیدڑ بھکیاں دیتے رہتے ہیں اور ان سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے یہاں نہیں آؤں گا۔“

”اور نہ ہی آپ باہر کہیں مجھ سے ملیں گے“ حمید الرحمن نے جلدی سے کہا۔

”چلیے ایسے ہی صحیح مگر یقین رکھیے کہ یہ لوگ مجھ سے بچ نہیں سکیں گے، بہت جلد میرے ہاتھ ان کی گردنوں پر ہوں گے۔“ عمر دراز نے اٹھتے ہوئے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھ کر کہا اور چلا گیا۔

”صاحب میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ یہ رقم میرے پوتے کو زندگی کی طرف کھینچ لائے گی۔“

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آئندہ اسے مزید کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہ وحید بیس میں مجھ سے مل لے۔ میں نے اسے اپنا کارڈ بھی دیا کہ اگر اسے کوئی اہم بات یاد آجائے تو وہ مجھے فوراً بتا سکے۔ اس نے میرے پوچھنے پر اپنی بستی کا نام بتایا جو نور گڑھ کے قریب ہی تھی۔



واپسی پر وحید بیس میں ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ سیما اور واحد کے مسینر اغوا کنندگان نے فون پر حمید الرحمن سے ان دونوں کی رہائی کے عوض پچاس لاکھ روپے بطور تادان طلب کیے تھے۔ انہوں نے اس کام کے لیے صرف تین دن کی مہلت دی تھی۔ اس نے فوری طور پر انسپکٹر عمر دراز کو اس کال سے آگاہ کیا اور وہ اب اس سے کال کی تفصیلات پوچھ رہا تھا۔ حمید الرحمن تشویش ناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”اغوا کرنے والوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ کیا تو وہ ان دونوں کو جان سے مار دیں گے۔“

”اور آپ نے پولیس کو انفارم کر دیا“ میں نے عمر دراز کی طرف دیکھ کر کہا ”اگر اغوا کنندگان وحید بیس کی نگرانی کر رہے ہوں گے تو انہیں یہ بات معلوم ہو چکی ہوگی اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنادیں“ میرا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔ حمید الرحمن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”میری عقل تو ماؤف ہو کر رہ گئی ہے“ وہ بے بسی سے بولا ”میں پچاس لاکھ صرف تین دن میں کہاں سے لاؤں؟“

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں“ انسپکٹر نے کچھ سوچ کر کہا ”میں نے یوں کھلے عام یہاں آکر غلطی کی ہے۔ جو مجرم اتنے چالاک ہوں کہ بھرے گھر سے دو افراد کو اغوا کر کے لے جائیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں ہوگا۔“

اتنے میں ایک ملازم نے حمید الرحمن کو فون آنے کی اطلاع دی۔ وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

”مس سیما کے اغوا کے سلسلے میں پولیس کیا کر رہی ہے؟“ میں نے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ کلیو بھی ملے ہیں“ اس کا انداز مبہم تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اس سے دریافت کیا۔

”انسپکٹر، کیا نور گڑھ میں کوئی خابان نامی اسپتال ہے۔“

”خابان“ وہ سوچ میں پڑ گیا ”نہیں خابان نامی کوئی اسپتال اس علاقے میں نہیں ہے۔ لیکن ذرا ٹھہرو۔۔۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری

”مجھے بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“ حمید الرحمن اٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”کھیل شروع ہو گیا ہے۔“ میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر سوچا۔

اس رات سونے کے بجائے میں اب تک پیش آنے والے حالات و واقعات پر غور کرتا رہا۔ ایک خاکہ سا میرے ذہن میں واضح ہو رہا تھا مگر ابھی اس کی کچھ درمیاں کڑیاں غائب تھیں جن کے مل جانے پر یہ مکمل ہو جاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہاں کھیلا جانے والا کیم بہت اونچے درجے کا تھا اور حمید الرحمن بھی اس میں ملوث تھا مگر کسی حد تک اس کا مجھے علم نہیں تھا۔



وحید پبلس سے نکلتے ہی ایک سفید کار میرا تعاقب کرنے لگی۔ تعاقب کا پتا لگنے میں میری چھٹی جس سے زیادہ پیچھا کرنے والے کا ہاتھ تھا۔ بلکہ بمپر تھا کیونکہ وہ تقریباً میری کار کے بمپر سے بمپر ملا کر چل رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ یا تو انتہائی نا تجربہ کار تھا یا پھر جس اتنے قریب ہونے کی وجہ سے مجھے عقبی آئینے میں اس کی صورت دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ سرخی مائل رنگت کا ایک اوسط شکل و صورت کا نوجوان تھا۔ عمر تقریباً پچیس چھبیس سال کے قریب تھی۔

میں اسے ساتھ لگائے ہوئے قصبے کے ایک اچھے ہوٹل تک لے گیا۔ پبلس سے میں بغیر ناشتہ کیے نکلا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ ناشتے کے بعد وہیں ہوٹل سے مس شیخ کو فون کروں گا۔ میں اس سلسلے میں پبلس کا فون نہیں استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔ ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کر کے میں اندر ڈائٹنگ ہال میں چلا آیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے پی سی او سے مس شیخ کے نمبر ملائے۔

”آپ کا کام ہو گیا ہے“ مس شیخ نے میری آواز سنتے ہی اطلاع فراہم کی۔ ”مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔ بورڈنگ اسکول والوں نے تصدیق کی ہے کہ مس سیما وحید الرحمن نے ان کے اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا تھا مگر انہوں نے اپنے ریکارڈ سے مس سیما کی تصویر دینے سے انکار کر دیا ہے۔ دوسری اہم اطلاع یہ ہے کہ فائن آرٹس کالج والوں نے مس سیما ولد وحید الرحمن نامی کسی طالبہ کے وجود سے انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پچھلے تین سال کے دوران میں اس نام کی کوئی لڑکی ان کے یہاں زیر تعلیم نہیں رہی ہے“ مس شیخ نے فرفر تمام رپورٹ کہہ سنائی اور میں نے وقت ضائع کیے بغیر ان کا شکریہ ادا کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ اگلا نمبر میں نے انسپکٹر عمر دراز کا ملایا۔ خوش قسمتی سے وہ تھانے میں موجود تھا۔ میری آواز سن کر وہ چکا۔

”اوہ! وکیل صاحب ابھی میں آپ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ سنا ہے کہ ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کے بارے میں سوچنے تو ہیں۔“

”تھانے میں بیٹھ کر فضول باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے“ میں

نے اس کی بات کاٹی ”مجھے“ اپنے پچھلے تین سال پہلے کے روڈ ایکسیڈنٹ کے ریکارڈ کو چیک کر کے بتاؤ کہ نور گڑھ ہائی وے پر ایک ٹرک اور کار کے تصادم میں سیما نامی لڑکی زخمی ہو گئی تھی۔ یہ حادثہ کس تاریخ کو ہوا تھا۔“

”تم سنجیدہ ہو“ وہ بے یقینی سے بولا ”اتنے پُرانے ریکارڈ کا تم نے کرنا کیا ہے؟“

”بس ہے ایک ضرورت۔ میں تمہیں بتا دوں گا مگر پہلے تم یہ کام کرو۔“

”تب تو آپ تھانے تشریف لے آئیں۔“

”نی الوقت میرا آنا مشکل ہے۔ ہاں اگر تم ریکارڈ چیک کر لو تو میں دس منٹ بعد پھر فون کروں گا۔“

”ٹھیک ہے“ اس نے کہا ”مگر دس منٹ نہیں، بیس منٹ بعد“ اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے باہر آکر کاؤنٹر پر فون اور ناشتے کے بل کی ادائیگی کی اور ایک میز پر آکر بیٹھ گیا۔ ویٹر کو چائے کا کہہ کر میں نے ہال پر ایک نظر دوڑائی۔ میرا تعاقب کرنے والا نوجوان ایک میز پر بیٹھا بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ چھریرے جسم کا مالک تھا۔ وہ اخبار کی اوٹ سے مجھے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ میں نے اُس شخص کو داد دی جس نے اس کا ٹھکے کے الو کو میرے پیچھے لگایا تھا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں مس شیخ کی رپورٹ پر غور کر رہا تھا۔ اس میں سب سے اہم نقطہ یہ تھا کہ سیما نے فائن آرٹس کالج میں داخلہ ہی نہیں لیا تھا۔

اہم سوال یہ تھا کہ سیما اس دوران میں کہاں رہی بلکہ وہ حادثے کے بعد کہاں رہی۔ یعنی حادثے کے بعد کوئی ایسی بات ہوئی تھی۔ جس کو چھپانے کے لیے نہ صرف ابا جان کو دس لاکھ کی خطیر رقم ادا کی گئی۔ بلکہ میری جان لینے کی بھی پوری پوری کوشش کی گئی۔ یعنی وہ راز ایسا تھا کہ اس کے افشا کے خوف سے ایک شخص کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ابا جان پیشہ ورانہ اخلاقیات کے کوئی خاص قائل نہ تھے مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا ہو گا کہ ان کے کپے کا اثر ان کی اولاد پر بھی پڑے گا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ بیس منٹ سے زیادہ گزر گئے تھے۔ میں نے تھانے کا نمبر ملایا۔ رابطہ ملتے ہی میں نے عمر دراز سے مطلوبہ ریکارڈ کے متعلق پوچھا۔

”ہاں مل گیا ہے اور خاصا خوفناک ہے“ وہ سنجیدگی سے بولا ”مورخہ چھ جون انیس سو بانوے کی صبح دس بج کر پینتالیس منٹ پر نور گڑھ ہائی وے کے بارہویں میل پر کار نمبر بی ایس ۷۶ ۹۳ سائنے سے آتے ٹرک نمبر ۱۰۲۳ سے ٹکرائی۔ حادثے کے وقت کار میں مس سیما کے علاوہ ڈرائیور بھی تھا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ مس سیما کو شدید زخمی حالت میں اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس

پارنگ میں کھڑی میری کار کی بریک آئل لائن میں سوراخ کر دیا تھا جس سے آئل رس رس کر ضائع ہو رہا تھا۔ کیونکہ میرے ہوٹل سے نکلنے وقت تمام آئل ضائع نہیں ہوا تھا اس لیے مجھے فوری طور پر بریکوں کی خرابی کا علم نہ ہوسکا بلکہ جب قصبے سے باہر نکلتے نکلتے بریک آئل کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا تب مجھ پر یہ راز کھلا نظر آ رہا ہے کہ میں اب بھی گاڑی روک سکتا تھا۔ اس مرحلے پر میری کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے وہ نوجوان اپنی گاڑی کے ساتھ موجود تھا۔ وہ ٹکریں مار کر کار روکنے کی میری ہر کوشش ناکام بنا دیتا۔ سڑک کا اگلا مرحلہ خوفناک کھائیوں اور پڑ پڑ موڑوں سے لبریز تھا۔ بریک فیل ہونے کی صورت میں یہاں سے زندہ بچ نکلنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ بھوکے آدم خور شیر کی کچھار میں نہتا جانے والے شخص کا زندہ سلامت بچ کر واپس آنا۔

ظاہر ہے کہ احق وہ نوجوان نہیں بلکہ میں تھا جسے دو قاتلانہ حملوں کے بعد بھی عقل نہیں آئی تھی۔ مجھے اتنا بے پروا نہیں رہنا چاہیے تھا۔ جبکہ میرے دشمنوں کے عزائم شروع ہی سے خطرناک تھے۔ اگرچہ شروع میں قسمت نے میرا ساتھ دیا تھا مگر وہ بھی آخر مجھے کتنے مواقع دیتی۔ آج میرے بچنے کا چانس بہت کم نظر آ رہا تھا۔ سفید کار ایک بار پھر میری طرف جارحانہ انداز میں بڑھی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو اس کی ٹکری سے محفوظ رکھا ورنہ سیدھا برابر والی کھائی میں جا گرتا۔ میں نے متعدد بار بریکوں پر دباؤ ڈالا مگر کار کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بریک آئل سارا ہی بہہ چکا تھا۔

کھائیوں سے بھر پور علاقہ شروع ہوتے وقت گاڑی کی رفتار چالیس میل فی گھنٹا ہو گئی تھی۔ یہ رفتار اس جگہ کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے موت ناچ رہی تھی۔ تقریباً تین سو گز آگے سڑک نے خاصا خطرناک موڑ لیا تھا۔ جس کے ایک طرف پہاڑ کی عمودی دیوار تھی اور دوسری طرف ایک اندھی کھائی۔ وہاں اس رفتار سے موڑ کاٹنے کی کوشش، خودکشی کے مترادف تھی۔ میں نے رفتار کم کرنے کے لیے خطرہ مول لیتے ہوئے دائیں طرف کی پہاڑی دیوار سے کار ہلکے ہلکے ٹکراتا شروع کر دی۔ اس طرح رگڑ سے رفتار کم ہونے لگی۔ یہ بات میرے حریف نے بھی بھانپ لی اور اس نے موڑ سے تقریباً سو گز پہلے ٹاک کر ایک عدد ٹکرا اور رسید کی۔ نتیجے میں کار کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ موڑ تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ سفید کار والے نے اس ٹکرا پر اکتفا کرنے کے بجائے مجھے ایک اور آخری اور فیصلہ کن ٹکرا مارنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی کار کی رفتار بڑھا کر میری طرف آنے لگا۔ موڑ بمشکل تیس گز دور تھا۔ یہ سفید کار والے کے لیے ایک بہترین موقع تھا۔ وہ مجھ سے بمشکل فٹ بھر کے فاصلے پر تھا۔ مگر اس موقع پر میں نے جو حرکت کی وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ عین اس وقت جب وہ اپنی گاڑی میری کار سے

کے بعد کا ریکارڈ خالی ہے۔ یہاں یہ درج نہیں ہے کہ مس سیمپا پر آگے کیا گزری اور ٹرک ڈرائیور گرفتار ہوا کہ نہیں۔
”ریکارڈ خالی ہے۔“ میں نے حیرت سے کہا ”مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ ایف آئی آر درج کرائی گئی تھی؟“
”ظاہر ہے“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”پھر بھی کیس ادھورا چھوڑ دیا گیا“ میں نے تیز لہجے میں کہا ”یہ ہے تم لوگوں کی کارکردگی حتیٰ کہ ریکارڈ تک نہیں رکھا گیا۔“
”پیارے وکیل ناراض مت ہو“ اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی ”یہاں ایسے کتنے ہی کیس ہیں جو یوں ہی بغیر تفتیش کے ادھورے چھوڑ دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان میں یا تو دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا یا پھر اوپر سے کوئی دباؤ نازل ہو جاتا ہے۔“
”یہاں کیا ہوا تھا۔ دلچسپی کا سامان نہیں تھا یا اوپر سے کوئی دباؤ نازل ہو گیا تھا“ میرا لہجہ تلخ ہونے لگا۔

”مجھے پریوں طرز کے تیر مت برساؤ“ وہ بُرا مان کر بولا ”میں اس وقت یہاں نہیں تھا۔“

”بہر حال ہماری پولیس کی شہرت یونہی تو نہیں ہو گئی۔“ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ”چلو یہ تو بتا دو کہ حادثے کے بعد سیمپا کو کون سے اسپتال لے جایا گیا تھا۔“

”خیابان اسپتال۔“ اس نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔
میں ہوٹل سے باہر نکلا تو تعاقب کرنے والا نوجوان بھی پلکتا ہوا پیچھے سے آیا۔ میں نے گاڑی نکالی اور نور گڑھ سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ ظاہر ہے کہ میرا رخ خیابان اسپتال کی طرف تھا۔ اگر وہاں سے مجھے مطلوبہ معلومات مل جاتیں تو میرے ذہن میں موجود خاکہ مکمل ہو سکتا تھا۔

سفید کار بدستور میرے تعاقب میں تھی۔ میں نے رفتار تیز کی اور کچھ دیر بعد ہم آبادی سے باہر آ گئے۔ سڑک خاصی حد تک سنسان تھی۔ میں اس نوجوان سے پیچھا چھڑانے کی تدبیر سوچ رہا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے خیابان اسپتال جاتا ہوا دیکھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میں تھانے چلا جاؤں اور انسپکٹر عمر دراز کی مدد حاصل کروں تو اس احتی سے نجات مل سکتی تھی۔ میں نے گاڑی واپس موڑنے کے لیے رفتار کم کرنا چاہی تب مجھ پر پہلی بار مشکف ہوا کہ بریک صحیح کام نہیں کر رہے ہیں۔ سامنے ہی ایک تنگ موڑ تھا جہاں تیز رفتاری سے مڑنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ بہر حال میں نے مسلسل بریک دبا کر رفتار کسی حد تک کم کر لی تھی۔ موڑ کاٹتے ہی میں نے ہینڈ بریک لگا کر گاڑی روکنا چاہی تھی کہ ایک زبردست دھچکا لگا اور کار کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ یہ کارستانی سفید کار والے نوجوان کی تھی۔ اس نے اپنی کار سے ٹکرا کر میری رفتار کم کرنے کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اب میری سمجھ میں اس کا منصوبہ آ گیا تھا کہ وہ کیوں سامنے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اس کے کسی ساتھی نے ہوٹل

مجھے کوئی سیریس چوٹ نہیں آئی ہے اور نہ ہی کوئی فریکچر ہوا ہے۔ البتہ سر کے عقبی حصے میں پتھر سے ٹکرانے کے نتیجے میں ایک عدد گوڑا نکل آیا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ اطلاع دے کر حیران کر دیا کہ مجھے تقریباً بیس گھنٹے بعد ہوش آیا ہے۔

”اگر آپ بستر محسوس کر رہے ہیں تو میں انپکٹر صاحب کو بلاؤں، وہ کافی دیر سے باہر بیٹھے آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں“ میں نے کچھ دیر سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
”ٹھوڑی دیر بعد وہ مسکراتا ہوا آگیا۔ ”مبارک ہو! ابھی تمہاری باری نہیں آئی ہے۔“ اس نے بڑے افسوس سے مبارک باد دی۔

”مجھے یہاں تک لایا کون تھا؟“ میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

”یہ اعزاز بھی اس خاکسار کو ہی حاصل ہوا ہے“ وہ مسکرایا ”میں تو سمجھا تھا کہ تم اللہ ہو چکے ہو مگر ٹھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ تم نے ایک شخص کو ضرور اللہ کر دیا ہے۔“

”حالانکہ اس خبیث نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی“ میں نے کراہ کر کہا۔ پھر میں نے اسے تفصیل سے خود پر ہونے والے قاتلانہ حملے کی روداد اور اپنے بچ نکلنے کی جدوجہد بیان کی۔

”لاش ناقابل شناخت ہے۔ وہ بڑی طرح جل گئی ہے“ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا ”مگر کار کے نمبر پلیٹ سے پتا چل گیا ہے کہ یہ ایک چوری شدہ کار تھی۔ مالک نے ایک روز پہلے اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ اب ہم صرف تمہارے بتائے ہوئے حلیے پر ہی انکھار کر سکتے ہیں۔“

”سیما والے کیس میں کوئی پیش رفت ہوئی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”فی الحال نہیں۔ مگر ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ آج صبح اغوا کنندگان نے پھر وحید بیلس فون کیا تھا۔ انہوں نے معیاد بڑھانے والی بات مان کر اب مزید دو دن کی مہلت اور دی ہے۔“

”یہ اطلاع تمہیں حمید الرحمن نے فراہم کی ہے؟“ میں نے بغور اسے دیکھا۔

”ظاہر ہے“ اس نے کندھے اچکائے ”ورنہ ہمیں کوئی الامام تو ہونے سے رہا۔“

میں یہ سن کر دم بخودہ گیا تھا کہ میں خیابان اسپتال میں ہی زیر علاج تھا۔ یعنی میں اپنی منزل تک ضرور پہنچا تھا مگر ذرا دوسرے طریقے سے۔ یہ اطلاع مجھے اس نرس نے دی تھی۔ وہ مجھے مختلف رنگ اور سائز کی متعدد گولیاں کھلانے آئی تھی۔ شروع میں اگرچہ میرا ارادہ کچھ اور تھا مگر نرس کی زبانی یہ اطلاع پا کر میں نے باطلی ناخواستہ اپنا یہ رنگین ارادہ منسوخ کر دیا۔ نرس کے جاتے ہی میں بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ حیرت انگیز طور پر نہ مجھے چکر آئے اور نہ

ٹکرانے والا تھا۔ میں نے کار کا ایکسیلریٹر دبایا اور خود دروازہ کھول کر باہر لڑھک گیا۔ اس کے بعد میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ کیا ہوا تھا۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ جب سفید کار والے نے مجھے آخری فکر رسید کرنے کی کوشش کی ہوگی تو اس کے ذہن میں اس کے دو فائدے ہوں گے کہ ایک تو میری کار کی رفتار بڑھ جائے گی اور دوسرے فکر سے اس کی رفتار کم ہو جائے گی جسے وہ بعد میں بریک لگا کر قابو کر لے گا مگر میرے رفتار بڑھانے سے اسے ٹکر مارنے کا موقع ہی نہیں ملا جبکہ فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی کار روکنے کی کوشش کی ہوگی مگر کم فاصلے کی وجہ سے یہ غیر موثر ثابت ہوئی اور وہ بدحواسی میں موڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہوئے میری کار کی پیروی میں کھائی میں جاگرا۔ کار سے باہر گرتے ہی میں سڑک پر بیلن کی طرح لڑھکتے ہوئے پھاڑی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میرا سر شاید کسی پتھر پر لگا تھا کیونکہ فوراً ہی آنکھوں کے آگے کچھ ستارے تاپے پھر ایک سورج سامنے سے طلوع ہو کر کھوپڑی کے عقبی حصے میں غروب ہو گیا۔ مگر مکمل تاریکی چھانے سے قبل میں نے وہ دھماکے سُن لیے تھے جو دونوں گاڑیوں کے کھائی میں گرنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔



آنکھ کھلنے پر ماحول کچھ نورانی سا ہو رہا تھا۔ فضا میں ہر طرف دودھیا روشنی تھی۔ میں خود کو ایک نرم و گداز بستر محسوس کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک حور جیسی حسینہ اور فرشتہ نما شخص کھڑے تھے۔ دونوں نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ فرشتہ نما شخص کے ہاتھ میں شاید میرا نامہ اعمال تھا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی جو اپنی وفات کے صدمے سے چور ہوا جا رہا تھا۔ میاں ساجد خوش قسمت ہو کہ جنت مل گئی ورنہ تمہارے اعمال ہرگز اس لائق نہیں تھے مگر اگلے ہی لمحے حور نما لڑکی نے سارا طلسم پاش پاش کر دیا۔ وہ قریب کھڑے شخص سے کہہ رہی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے یہ ہوش میں آگیا ہے“ میں کراہ کر رہ گیا۔ ظاہر ہے یہ اسپتال تھا اور وہ دونوں نرس اور ڈاکٹر تھے۔ میں ڈھیٹ بڑی ایک بار پھر بچ گیا تھا۔ ورنہ میں جس موڑ پر بے ہوش ہوا تھا دوسری طرف سے آنے والا کوئی ٹرک میرا قیہہ مٹاتا ہوا گزر سکتا تھا۔

”اب آپ کیسے فائل کر رہے ہیں؟“ ڈاکٹر نے مجھ پر جھکتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔ ہوش میں آنے کے بعد جسم کے مختلف حصوں میں درد جاگ اٹھا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی حد سے زیادہ نہیں تھا۔ البتہ سر میں باقی حصوں کی نسبت زیادہ تکلیف تھی۔ جس سے میں نے ڈاکٹر کو نگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”باقی سب تو ٹھیک ہے، بس یہاں کچھ گزیدہ محسوس ہو رہی ہے“ میں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے قریب کھڑی نرس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کا گلابی چہرہ مزید گلابی ہو گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ

”بالکل‘ میں ان سے نہیں‘ آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں“ میں نے جلدی سے کہا۔
”اوہ اچھا“ ڈاکٹر نے معنی خیز انداز میں لڑکی کی طرف دیکھا، وہ باہر نکل گئی ”اب بولو۔“

میں نے اختصار سے سیما کے اغوا اور اس مسئلے سے آگاہ کیا جس کے پیچھے میں مارا مارا پھر رہا تھا اور دشمن مجھے قتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا ”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں سیما کے ایکسیڈنٹ کا ریکارڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”اس کے لیے تمہیں ریکارڈ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تم مجھ سے ہی سب کچھ سن لو“ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا ”معاف کرنا میں مریض کو سگریٹ آفر نہیں کرتا۔ ہاں تو ہوا یہ کہ جب سیما نامی یہ لڑکی آئی سی یو میں لائی گئی تھی تو وہاں میری ہی ڈیوٹی تھی۔ اس کے ابتدائی کاغذات اور میڈیکل رپورٹ بھی میں نے ہی تیار کی تھی۔ لڑکی سیریس انجری تھی۔ خاص طور پر اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ جب وہ اسپتال لائی گئی تھی تو وہ کوما میں تھی۔ وینڈ شیلڈ کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا اس کی بائیں کٹہٹی میں پیوست تھا۔ ہم نے فوری طور پر اس کے سر کے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ اس وقت لڑکی کی حالت اتنی نازک تھی کہ وہ کسی بھی وقت زندگی سے اپنا رشتہ توڑ سکتی تھی۔ تقریباً تین گھنٹے بعد جب اسے آپریشن ٹیمپرسے باہر لایا گیا تب بھی اس کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ بدستور کوما میں تھی۔ آپریشن کرنے والے سرجن کے مطابق شیشے کے ٹکڑے نے اس کے دماغ کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اگر وہ بچ بھی جاتی تب بھی یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی بصارت سے محروم ہو جاتی یا وہ سن نہیں پاتی یا پھر اس کا دماغی توازن بگڑ سکتا تھا۔“

ڈاکٹر اختر نے رک کر گویا اپنی یادداشت تازہ کی اور سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

”آپریشن کے بعد مس سیما کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ آپریشن کے چوبیس گھنٹے بعد اس کے دل کی دھڑکن غیر متوازن ہونے لگی تھی۔ پہلے تو ہم نے مروجہ طریقوں سے دل کو متحرک رکھنے کی کوشش کی مگر دھڑکن بدستور بے قاعدہ ہوتی رہی۔ ایک دفعہ تو دل رک بھی گیا تھا۔ مجبوراً اسے دل کو رواں رکھنے والی مشین سے جوائنٹ کرنا پڑا۔ یوں اس کا دل صحیح طریقے سے دھڑکنے لگا۔ وہ سانس بھی لے رہی تھی۔ ہم بذریعہ انجکشن اور ڈرپ خوراک اس کے جسم میں پہنچا رہے تھے۔ مگر وہ کوما سے باہر نہیں آ رہی تھی۔“

”یعنی اس کے ہوش میں آنے کا امکان خاصا کم تھا“ میں نے تصدیق چاہی۔

”کچھ کہنا مشکل ہے“ وہ کندھے اچکا کر بولا ”بہی کبھار ایسے

میرے قدم لڑکھڑکائے۔ تھوڑی سی چہل قدمی اور اٹھک بیٹھک سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میں جسمانی طور پر خاصی حد تک ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اتنے میں ڈاکٹر آگیا اور مجھے یوں چلتے پھرتے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کو پورے بیس گھنٹے کے بعد ہوش آیا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔
”اس کے باوجود میں بالکل صحیح ہوں“ میں نے اسے یقین دلایا مگر ساتھ ہی جتا بھی دیا ”البتہ مجھے اگلے چند گھنٹوں میں کھانا نہیں فراہم کیا گیا تب میرے فوت ہو جانے کے خاصے امکانات ہوں گے۔“

”تھوڑی دیر میں آپ کو ناشتا مل جائے گا۔ مگر آپ بستر پر لیٹ جائیے۔“

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس لیٹنے کا وقت ہے۔“

میرا عزم دیکھ کر اس نے واک آؤٹ کر جانا زیادہ بہتر سمجھا۔
”میں ڈاکٹر اختر کو بھیجتا ہوں وہی آپ کو دیکھیں گے۔“

”ضرور! مگر ناشتا ذرا بھاری ہو تو بہتر ہے“ میں نے کہا اور وہ مجھے خاصی غلط نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر اختر سے پہلے ناشتا آگیا۔ جو معمول کے مطابق تھا یعنی ایک بواکل انڈا، ڈبل روٹی کے چار سلائس، مکھن کی نکیا اور ایک گلاس دودھ۔ اگرچہ یہ بھوک مٹانے کے لیے قطعی ناکافی تھا مگر اس سے پیٹ کی کسی حد تک تسلی ہو گئی۔

ڈاکٹر اختر ایک خوش مزاج، شگفتہ سا شخص نکلا۔ اس نے آتے ہی کہا ”کیوں بھی، تمہاری کون سی ٹرین چھوٹی جا رہی ہے جو یوں بھاگنے کے لیے پرتول رہے ہو، کچھ ہمیں بھی خدمت کا موقع دو۔ دو چار دن یہاں رہ کر۔“

”جانے کو تو میرا دل بھی نہیں چاہ رہا“ میں نے ایک سرزد آہ بھر کر اس تباہ کن حسینہ کو دیکھا جو ڈاکٹر اختر کے عقب میں کھڑی تھی۔
”مگر کسی کی جان خطرے میں ہے“ وہ میرا مطلب سمجھ کر ہنسا اور نرس پھر گلابی ہو گئی۔

”اب کس کی زندگی خطرے میں ہے۔ سنا ہے ایک بندہ تو پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے“ وہ ہنس کر بولا۔

اچانک میرے ذہن ایک خیال آیا اور میں نے اس سے کہا ”میں ذرا تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں“ میں نے کن انکھیوں سے نرس کو دیکھا جو سر جھکائے کھڑی تھی۔

”تنہائی میں!“ ڈاکٹر ذرا حیران ہوا پھر ہنس کر بولا ”تو پھر میں چلا جاتا ہوں“ لڑکی تو شرم سے لال ہوئی گئی تھی مگر مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ بھی خاصا سرخ ہو چکا تھا۔

”ڈاکٹر!“ نرس نے احتجاجی انداز میں کہا ”دس ازناٹ اے جو کہ۔“

”اودان دے رہا ہے۔“
”تم اس کے جھانے میں مت آؤ۔ اس کی اور اس کے
آدمیوں کی کڑی نگرانی کراؤ بلکہ ان کے نمبروں پر آیزرویشن
لگوادو۔“

”اور پھر معطل ہو جاؤں“ وہ طنز سے بولا ”حمید الرحمن کی پہنچ
خاصی اوپر تک ہے۔“

”تب تمہاری مرضی جو کرو“ میں نے جلد بھنے انداز میں کہا
”بس میری ایک درخواست مان لو۔ وہ یہ کہ پریس اور دوسرے
لوگوں کو یہی بتاؤ کہ میں حادثے میں شدید زخمی ہوں۔“
”کہیں چھپ کر جانا چاہ رہے ہو“ وہ سمجھ دار آدمی تھا فوراً
بات کی تہہ میں پہنچ گیا۔

”ہاں! مگر کہاں جا رہا ہوں، یہ واپس آکر بتاؤں گا۔“
”اگر پہنچ کر واپس آگئے۔ جیسے بانڈ کی اولاد۔“ اس نے
خالص پولیسیانہ انداز میں کہا اور فون رکھ دیا۔

میں نے ڈاکٹر اختر کو ڈھونڈ کر ساری بات سمجھائی۔ اس نے
بھی تعاون کی ہامی بھری۔ میں نے اسپتال سے اپنے کپڑے اور
دوسری چیزیں لیں۔ اگرچہ کپڑے کئی جگہوں سے خراب ہو گئے تھے
مگر مجبوری تھی میں وحید پریس کی طرف جا نہیں سکتا تھا جہاں میرا
سامان پڑا تھا۔

اسپتال کے باہر سے میں نے ایک ٹیکسی والے کو میٹر سے سو
روپے زائد پر دارالحکومت چلنے کے لیے رضامند کر لیا۔ تقریباً چار
گھنٹے بعد میں اپنے دفتر کے سامنے اتر رہا تھا۔ ٹیکسی والے نے
راکت کی طرح ٹیکسی دوڑائی تھی۔ اسے کرائے کی رقم دے کر میں
اوپر اگلیا۔ جہاں مس شیخ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔

”کیا کوئی حادثہ یا جھگڑا وغیرہ ہو گیا ہے“ انہوں نے اندازے
لگائے۔

”آپ کا پہلا اندازہ درست ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا ”مگر
آپ سب سے پہلے مجھے گرم گرم کافی پلاؤں اور چہرہ اسی کو گھر بھیج
کر میرا ایک سوٹ منگوالیں“ میں نے فون اپنی طرف کھینچتے ہوئے
کہا اور نمبر ڈائل کیا، تیسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

”ہیلو، کس سے بات کرنی ہے؟“ دوسری طرف سے کاٹ
کھانے والے انداز میں پوچھا گیا۔ میں مسکرا دیا۔

”ایک جو رو کے غلام سے۔“

”بے تو! خبیث کہاں غائب ہو گیا تھا“ وہ چلانے لگا۔ راحیل
میرا بے تکلف دوست تھا۔ وہ بہترین سرجن تھا ”میں سوچ رہا تھا کہ
اب شاید تجھ سے جنم میں ملاقات ہوگی۔“

”مشکل ہے میرا وہاں جانے کا کافی وقت کوئی ارادہ نہیں ہے۔
میری مراد تیرے گھر سے ہے“ اس سے پہلے کہ وہ غصے سے آؤٹ
ہو جاتا، میں نے کہا ”چھوڑ ان باتوں کو اصل میں مجھے تجھ سے کچھ
کام ہے۔“

مریض معجزانہ طور پر ہوش میں بھی آجاتے ہیں مگر ہمارے باہروں
کی رائے میں اس کا امکان کم تھا۔ وہ جسمانی طور پر زندہ تھی مگر
شاید دماغی طور پر اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ دوسرے لفظوں
میں وہ مصنوعی طور پر زندہ تھی ”وہ چپ ہو گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا ”کیا وہ بچ گئی
تھی؟“

”مجھے معلوم نہیں“ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا ”ایک ہفتے بعد
اس کے رشتے دار اسے کسی اور اسپتال لے گئے تھے۔ جہاں اسے
دیکھنے کے لیے کوئی غیر ملکی ڈاکٹر آ رہا تھا۔“
”کون سے اسپتال؟“

”نام تو معلوم نہیں ہے مگر تھا وہ دارالحکومت کا ہی کوئی
اسپتال“ وہ سوچتا ہوا بولا ”ہاں شاید ایک شخص بتا سکے۔ ہمارے
ہاں کا سینئر نیکیشن ہے۔ جمال ترائی شاید وہ بتا سکے کیونکہ مس سیما
کی دوسرے اسپتال کی منتقلی کے وقت وہ مشین انٹینڈنٹ کے طور پر
ساتھ گیا تھا۔“

”مس سیما کے رشتے داروں نے اسپتال سے لے جاتے وقت
یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔“

”اصولی طور پر وہ اس کے پابند ہوتے ہیں۔ مگر انہوں نے مس
سیما کو لے جاتے وقت ایسی کوئی اطلاع نہیں دی تھی“ اس نے
افسوس سے سر ہلایا پھر اٹھتے ہوئے بولا ”میں جمال کو بھیجتا ہوں۔“
تقریباً دس منٹ بعد جمال ترائی میرے سامنے تھا۔ وہ تقریباً
تیس تیس سال کا صحت مند شخص تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سیما کو
لے جانے کے لیے انہیں ایک ہارٹ مشین انٹینڈنٹ کی ضرورت
تھی اس لیے اسے ساتھ لے جایا گیا۔

”کون سے اسپتال لے گئے تھے“ میں نے اس سے پوچھا۔
”فرینڈز کیر اسپتال“ اس نے بتایا۔ یہ دارالحکومت کا ایک

انتہائی منگا اور جدید ترین سولیات سے مزین اسپتال تھا جہاں
صرف امرا ہی جانے کی ہمت کر سکتے تھے۔ ساری بات واضح ہو چکی
تھی بس ایک تصدیق کرنا باقی رہ گئی تھی۔ میں نے اسپتال کے
ریسیپشن سے تھانے فون ملایا۔

”ہیلو عمر دراز! میں بات کر رہا ہوں ساجد۔“
”کیوں کر رہے ہو“ اس نے جھلا کر کہا ”ساری نیند کا بیڑا غرق
کر دیا۔“

”جب محافظ قوم ہی سو رہے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے“ میں نے
سرد آہ بھر کر کہا ”دیکھو“ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں، اس لڑکی سیما
کی زندگی خطرے میں ہے۔“

”مجھے پتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔
”پھر بھی پڑے سو رہے ہو“ میں تیزی سے بولا۔

”کیا کریں پھر؟“ فون پر کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے وہ
انگڑائی لے رہا ہو ”ویسے وہ تیرا حمید الرحمن ایک کروڑ روپے

جیب فور وہیل ڈرائیو تھی اور راستے میں ٹریفک بھی بہت کم تھا۔ ورنہ میں یا تو کسی گاڑی سے ٹکرا چکا ہوتا یا پھر کسی گھرے گھڑ میں گر چکا ہوتا۔ شہر سے نور گڑھ کا فاصلہ طے کرنے میں صرف تین گھنٹے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اس سارے منصوبے کو جان چکا تھا جو ایک شاطر شخص نے ترتیب دیا تھا۔ میرے پاس اس کے خلاف یقینی ثبوت بھی تھا۔ مگر اتنی جلدی کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاطر اپنے منصوبے کے سب سے گھناؤنے حصے پر عمل درآمد کر چکا ہو گا مگر ایک موہوم سی امید کی کرن ابھی باقی تھی۔ میں پہلے نور گڑھ کے تھانے گیا۔

وہاں سے پتا چلا کہ عمر دراز پولیس پارٹی لے کر وحید پیلس گیا ہوا تھا۔ میں نے جیب وحید پیلس کی طرف دوڑادی۔ انسپکٹر عمر دراز پیلس کے باہر ہی مل گیا۔ وہ جیب پر سوار ہو کر کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ حمید الرحمن بھی اس کے ساتھ تھا مگر سب سے حیرت انگیز موجودگی اس کے بیٹے واحد کی تھی۔ وہ سیمائے ساتھ ہی اغوا ہوا تھا مگر اب یہاں نظر آ رہا تھا۔ میری حیرانی بھانپتے ہوئے عمر دراز نے مختصر لفظوں میں بتایا کہ واحد اغوا کنندگان کی قید سے چھوٹ کر بھاگ آیا تھا اور اب وہ اس کی رہنمائی میں مجرموں کے ٹھکانے پر چھاپا مارنے جا رہے تھے۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب سیمائی وہ غنچہ دہن، سبکی بدن مجھے زندہ حالت میں دیکھنے کو شاید نہ ملے۔ مجرم اپنا کام کر گزرا تھا اور اسی وجہ سے واحد یہاں نظر آ رہا تھا۔ میں ایک خواب زدہ سی کیفیت میں جیب ڈرائیو کر رہا تھا۔ یہ جیب بھی راجیل سے مستعار لایا تھا۔ میرے تصور میں بابا رہ وہ خوب صورت چہرہ آ رہا تھا جو میرے دل کے فریم میں تصویر کی طرح فٹ ہو گیا تھا مگر شاید اب وہ کبھی مجھے دیکھنے کو نہ ملے۔

جیب ایک دھچکے سے رکی اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ آگے پولیس پک اپ اور عمر دراز کی جیب بھی رک گئی تھیں۔ یہ ایک نسبتاً نشیبی علاقہ تھا جو قصبے کے جنوب میں تھا۔ واحد اشارے سے سڑک کے نیچے عمر دراز کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمر دراز نے اپنے جوانوں کو کچھ ہدایات دیں اور وہ سڑک سے نیچے اتر کر منظم ہو کر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ ”مجرموں کا ٹھکانا اس جھنڈ کے پیچھے ہے۔“ عمر دراز نے آکر مجھے بتایا۔

”مگر اب شاید دیر ہو چکی ہے“ میں نے ایک گہری سانس لی اور نیچے اتر آیا۔ میں انسپکٹر کے ساتھ نیچے واقع درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ میری سرد آہ پر عمر دراز نے متنی خیر انداز میں مجھے دیکھا تھا مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ جیسے مجرم اس کی مٹھی میں ہوں۔

پولیس کے جوان پورے علاقے میں پھیل کر منظم طریقے سے مجرموں کے ٹھکانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عمر دراز نے کچھ

”ظاہر ہے تجھ جیسا... بغیر مطلب کے کیوں فون کرنے لگا“ خالی جگہ میں اس نے ایک ناقابل اشاعت بات فٹ کی تھی ”کام کیا ہے؟“

”وہ تیرا دوست ہے نا سجاد... وہی جو فرینڈز کیر اسپتال میں چیف میڈیکل آفیسر ہے؟“

”ہاں، تو کیا تو نے اپنے پوسٹ مارٹم کی پیشگی بلنگ کرائی ہے؟“ ”نکو اس مت کر“ میں نے بھٹا کر کہا ”سنجیدہ ہو جا“ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“

”اچھا پھر میں کلینک کے بعد فارغ ہوں گا تو آجا“ وہ سوچ کر بولا۔

”کبھی کلینک کی جان چھوڑ بھی دیا کر۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

وہ بادل ناخواستہ بولا ”ٹھیک ہے پھر تو آجا۔“ ”میں نہیں آپ آرہے ہیں میرے آفس۔“ میں نے اس کی گالیاں سننے بغیر ریور رکھ دیا۔ مس شیخ نے بھاپ اڑاتی کافی کا کاک مجھے پکڑایا۔ جب تک میں نے کافی پی کر کپڑے بدلے۔ راجیل آگیا۔

”خبیث شخص! میں راستے میں دو مرتبہ حادثے سے بال بال بچا ہوں۔“

”ماہر ڈرائیور ہوں گے“ میں نے افسوس سے کہا۔ جواب میں اس نے مجھے درجن بھر گالیوں سے نوازا۔

”باقی راستے میں“ میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ راستے میں اس نے مجھے اپنے تازہ ترین گھریلو مسئلے سے آگاہ کیا جو اس کی ستم ظریف بیوی کی پیداوار تھا۔ داستان خاصی دردناک تھی مگر میرا ہنسنے ہنسنے برا حال ہو گیا۔

”بائی گاڈ یار! مجھے کھل کر ہنسنے ہوتے ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا۔“ اس کے چرنے پر میں نے کہا۔

”میں جو کر ہوں؟“ وہ مزید چڑ گیا ”تجھے لپٹنے سنا رہا ہوں؟“ ”بس یار! اپنی زندگی میں اتنے اچھے ہیں کہ اب ان پر ہنسی آنے لگی ہے“ میں نے سرد آہ بھری۔

”ہنس لے بیٹا۔ جب تیری باری آئے گی تو پتا چلے گا“ اس نے جوابی سرد آہ بھر کے کہا۔

فرینڈز کیر خاصا بڑا اسپتال ثابت ہوا۔ اسپتال کے چیف میڈیکل آفیسر سجاد نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ رسمی کلمات کے فوراً بعد میں مطلب کی بات پر آ گیا۔

تفصیل سن کر اس نے پہلے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ایک سرد آہ بھری اور آخر میں بولا ”آئیے میرے ساتھ۔ آپ کے تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا۔“



میں خاصے جنونی انداز میں جیب دوڑا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے

کیا۔

حمید الرحمن کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس پر پسینے کے قطرے چپکنے لگے۔ خود میرا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ اندر ایک آڑی ترچھی لاش سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔

”میری بچی، میرے بھائی کی نشانی۔“ حمید الرحمن یک دم دھاڑیں مارتا ہوا لاش پر گر گیا۔ اس نے لاش کے چہرے سے چادر ہٹادی اور ہم دونوں ہی بھونچکے رہ گئے۔ خاص طور سے حمید الرحمن کی دھاڑیں یوں رک گئیں جیسے بٹن دبانے سے ٹی وی آف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ چادر تلے جو چیز موجود تھی۔ وہ لاش ہرگز نہیں تھی بلکہ وہ سیما بھی نہیں تھی۔ اس کی ہٹ پٹائی آنکھیں اور تلو مار مار کر مونیٹس اسے بہر حال وہ ثابت نہیں کر رہی تھیں جو ہم نے سوچ رکھا تھا۔

”رحیم بخش“ حمید الرحمن کے منہ سے شاید موصوف کا نام نکلا اور پھر وہ پلٹ کر اندھا دھند دروازے کی طرف دوڑا۔ مگر عمر دراز کا ایک دھکا اسے واپس کمرے میں لے آیا۔

”میری بیٹی، میری بچی!“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔
”اور کس بھتیجی کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے کہا ”اس سیما کی جسے تم نے اپنے مکروہ عزائم کی بھیٹ چڑھانا چاہا تھا یا اس سیما

جوانوں کو دائیں بائیں سے آگے بھیج دیا تاکہ اگر مجرم فرار ہونے کی کوشش کریں تو یہ ان کی کوشش کو ناکام بنائیں۔ درختوں کے جھنڈ میں گھس کر اس نے مجھے اور حمید الرحمن کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھ گیا۔

”وکیل صاحب، دعا کریں میری بچی خیریت سے ہو۔“
حمید الرحمن نے رقت آمیز لہجے میں کہا اور میں دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد پولیس والوں نے یک دم اس چھوٹے سے مکان پر حملہ کر دیا جو درختوں کے درمیان صاف نظر آرہا تھا۔ عمر دراز نے پولیس کے رواجی انداز میں لات مار کر دروازہ کھولا اور پولیس دندناتی ہوئی اندر گھس گئی۔ عمر دراز اندر گھسنے والوں میں سب سے آگے تھا۔ وہ واپس بھی سب سے پہلے ہی آیا۔

اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے خدشات بلکہ توقعات درست تھیں۔ وہ مردہ سی چال چلتا ہوا ہم دونوں کے قریب آیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھے کیا خبر سنائے گا مگر میں زندگی سے بھرپور اس وجود کو مردہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ پلٹوں اور اندھا دھند یہاں سے بھاگ نکلوں مگر جب اس نے ہم دونوں سے اندر چلنے کے لیے کہا تو میں جیسے سحرزدہ سا اس کے پیچھے چل پڑا۔ مکان کا داخلی دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا۔ اندر داخل ہو کر عمر دراز نے ہاتھ سے ایک کمرے کی طرف اشارہ

سینس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سبھی کہانیاں

ریٹائرڈ ڈی ایس پی ملک صفیات کی ڈائری

دستِ انتقام

اسیر ہوں

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ہمشیرہ وارن زندگی کے پے چید کیسیوں کی دوا
جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں

قیمت فی کتاب ۱۴ روپے، ڈاک خرچ ۱۶ روپے۔ چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانیے پر ڈاک خرچ معاف

پوسٹ بکس نمبر ۲۳۔ رمضان چیمبرز

نورہ دختر اخبار جنگ آئی آئی چند ریگر روڈ کراچی ۷۴۰۰

مزا امجد بیگ کی یادداشتیں

شیطانِ صفت

سبز قدم

قانونی پیچیدگیاں عدالتی کارروائی کے اہم موزونکات
زن، زور اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

کی جو فرینڈز کیریئر اسپتال کے ایک کمرے میں لاش کی سی زندگی گزار رہی ہے۔

عمر دراز چونک اٹھا اور حمید الرحمن کا چہرہ زرد پڑ گیا۔
”کیا... وہ اصل سیما نہیں تھی“ عمر دراز نے شک و شبہ سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں“ اصل سیما درحقیقت مریچکی ہے مگر یہ شخص... میں نے حمید الرحمن کی طرف اشارہ کیا ”اس معصوم کو چین سے مرنے بھی نہیں دے رہا“ میرے تصور میں وہ دھانچا نما چیز آگئی۔ جو چیف میڈیکل سجاد نے مجھ سے سیما کے نام سے متعارف کرائی تھی۔
راکھ جیسا چہرہ جس پر زندگی کی کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ صرف مٹھینیں گواہ تھیں کہ وہ فی الوقت زندہ ہے مگر مردے سے بدتر حالت میں۔ سجاد نے بتایا تھا کہ تین سال پہلے ہی تصدیق ہو چکی تھی کہ لڑکی کا دماغ موت کی گھرائیوں میں جا اترتا ہے۔ مگر اس کے لواحقین نے اس کے جسم سے مٹھینیں ہٹانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سیما کی حالت کا تصور کرتے کرتے میرے اندر اشتعال کی ایک شدید لہر اٹھی۔ میں نے اچانک حمید الرحمن کے منہ پر مٹکا رسید کیا۔ وہ نیچے گر گیا۔ جب تک عمر دراز مجھے قابو کرتا، میں اسے تین چار ٹھوکریں رسید کر چکا تھا۔ وہ نیچے گرا سکا رہا تھا۔
اچانک مجھے خیال آیا اور میں چلا اٹھا ”سیما کہاں ہے؟“
”تسلی تسلی“ عمر دراز مجھے تھپکتا ہوا بولا ”وہ خیریت سے ہے“
پھر اس نے ایک کانٹیل کو حکم دیا کہ مس سیما کو لے آئے۔ وہ اسی مکان میں موجود تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی حسین آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔



کچھ دیر بعد ہم نور گڑھ کے تھانے میں تھے۔ حمید الرحمن کو اس کے بیٹوں اور چیلوں سمیت حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں عمر دراز کو اپنی تفتیش کا ماحصل بتا رہا تھا۔
”میں شاید نور گڑھ کا رخ بھی نہ کرتا اگر والد صاحب کا خفیہ اکاؤنٹ میری نگاہوں میں نہ آجاتا۔ مگر شاید قدرت کو اس ڈرامے کا ڈراپ سین اسی طرح کرنا مقصود تھا۔ حمید الرحمن کی بد قسمتی کہ جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا تو کند ٹوٹ گئی یعنی میرے ابا جان انتقال فرما گئے۔ یہ بات تو طے ہے کہ وہ حمید الرحمن کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ یہیں سے حمید الرحمن کی عقل چوہٹ ہو گئی۔ اس نے مجھے بھی والد صاحب کے پاس پہنچانے کی مجنونا نہ کو ششیں کیں مگر زندگی باقی تھی۔ البتہ میرا شبہ یقین میں ضرور تبدیل ہو گیا۔ خاص طور پر حمید الرحمن پر کیونکہ اپنے آنے کی اطلاع میں نے اسے ہی دی تھی۔

و میت نامے کی رو سے مس سیما کو ان کی وراثت اکیس سال کا ہونے پر ملتی تھی۔ اگر وہ اس سے پہلے انتقال کر جاتی تو یہ تمام جائیداد اور کاہد بار ایک ٹرسٹ کی شکل میں تبدیل کر دیے جاتے

چنانچہ حمید الرحمن بڑے سکون سے مس سیما کے اکیس سال کا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اگرچہ یہ کتنا دشوار ہے کہ اس صورت میں اس کی حکمت عملی کیا ہوتی۔ اب یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ سیما اکیس سال کی ہونے سے قبل ایک حادثے کا شکار ہو کر موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ اگر وہ مرجاتی تو حمید الرحمن اور اس کی اولاد ان سب آسائشوں سے محروم ہو جاتے۔ سیما کا دماغ شدید نوعیت کی ضرب سے مردہ ہو چکا تھا مگر اس کا جسمانی سسٹم کام کر رہا تھا۔ البتہ اس کے جسم سے مٹھینیں ہٹادی جائیں تو اسے مرنے میں چند سیکنڈ بھی نہ لگتے۔ اگر ایسا مریض ہوش میں نہ آئے تو ڈاکٹر بھی مٹھینیں ہٹانے کی رائے دیتے ہیں۔ حمید الرحمن کو ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ اس کی بھتیجی مریچکی ہے مگر اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ وہ مظلوم لڑکی اس طرح تین سال سے ایک بستر پر گوشت کے بے جان ٹکڑے کی طرح پڑی ہے۔ ”میرے لہجے میں ناسف آگیا۔

”کس قدر درندے ہوتے ہیں یہ دولت کے پجاری بہر حال والد صاحب کی موت نے حمید الرحمن کو نئی پریشانیوں سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ اس نے قانونی کارروائیوں کے لیے ایک دوسری لڑکی کو سیما کے روپ میں پیش کر دیا۔ اس بات کا اس نے خیال رکھا کہ لڑکی میں سیما کی مشابہت موجود ہو۔“ میں نے برابر میں بیٹھی بنا سستی سیما کی طرف دیکھا ”حمید الرحمن نے ان تمام نوکروں کو بھی پولیس سے نکال دیا جو سیما کو شناخت کر سکتے تھے۔ سیما کو سکی اور غصہ ور مشہور کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ کوئی اس کے زیادہ قریب نہ آئے پائے۔“

”شروع میں حمید الرحمن کا منصوبہ یہی تھا کہ وراثت کی منتقلی کے بعد وہ مشہور کر دے گا کہ سیما ایک حادثے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد وہ اصلی سیما کے جسم سے منسلک مٹھینیں ہٹانے کی اجازت دے دے گا۔ یوں اسے ایک اصلی ڈیوٹھ سرٹیفکیٹ بھی مل جائے گا جس پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔ میرے نور گڑھ آنے کی خبر سن کر اسے خطرہ محسوس ہوا۔ ویسے بھی اب اس کا منصوبہ اس مرحلے پر آچکا تھا کہ وہ کسی نئے شخص کو اعتماد میں نہیں لے سکتا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ اس کے گٹھ جوڑی مجبوری یہ تھی کہ حادثے کے فوراً بعد وہ بھی نور گڑھ پہنچ گئے تھے اور ان سے یہ بات چھپی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ حمید الرحمن نے دس لاکھ دے کر انہیں ساتھ ملانے کی کوشش کی اور کامیاب رہا“ میں نے ذرا توقف کے بعد دوبارہ کتنا شروع کیا ”بدلے ہوئے حالات کے تحت اس نے پہلے مجھے ٹھکانے لگانے کی کوشش کی مگر اس میں ناکامی کے بعد اس نے یہ نیا خباثت سے پُر منصوبہ بنایا کہ سیما کو بظاہر اغوا کر دیا جائے پھر کوئی ایسا چکر چلایا جائے کہ ”اغوا کنندگان“ مشغول ہو کر سیما کو ہلاک کر دیں۔“ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا جو اپنی وفات کا سن کر کچھ طیش میں

ہو گئی تو میرا بے چین ہونا فطری امر تھا۔ وہ صرف میری سہیلی ہی نہیں تھی بلکہ سچی بہنوں سے بڑھ کر تھی۔ میرے ڈیڈی آئی بی میں اعلیٰ عہدے پر ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کی مدد حاصل کی اور یہ معلوم کر لیا کہ سیما ایک حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے اور اس کا چچا اس کی دولت پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنی دوست کو یوں لاچار دیکھ کر مجھے شدید دکھ ہوا۔ پھر شاید خدا نے میری دعائیں قبول کر لیں اور اسے ہوش آگیا۔

”ہوش آگیا“ میں بھونچکا رہ گیا ”تو پھر وہ کون تھی جسے میں اسپتال میں دیکھ کر آ رہا ہوں اور سیما کہاں ہے؟“

”سیما کو ہم نے ایک اور اسپتال میں منتقل کر دیا تھا۔ اتفاق سے وہاں ایک لڑکی ایسے ہی حادثے کی وجہ سے ایڈمٹ تھی۔ میرے والد نے اپنے اثر رسوخ سے کام لے کر اس لڑکی کو سیما کی حیثیت دے دی۔ مگر گزشتہ دو سال سے حمید الرحمن یا اس کا کوئی بیٹا سیما کو دیکھنے نہیں گئے۔ تم دو سال بعد پہلے شخص تھے جو سیما کو دیکھنے گئے تھے۔“

”مگر تم سیما کی حیثیت سے وحید پلس کیسے پہنچ گئیں؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”مت پوچھو کہ اس کے لیے کتنے پاز بیلنے پڑے اور حمید الرحمن کو کیا چکروں کا پڑا“ وہ گہری سانس لے کر بولی ”بہر حال ہمارا مقصد صرف سیما کو اس کی وراثت دلانا ہی نہیں تھا بلکہ اس کے چچا کو اس کے کرتوتوں کی سزا بھی دلوانا تھا۔ کیونکہ اس پر یہ شبہ بھی تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو سازش کر کے ہلاک کیا تھا۔ سیما کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ حمید الرحمن سے سخت نفرت کرتی تھی اس لیے وہ بہت کم وحید پلس آئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنی وراثت حاصل کرے ہی پہلی فرصت میں حمید الرحمن اور اس کے گھروں والوں کو اس سے بے دخل کر دے گی۔ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ہی میں کچھ عرصے کے لیے حمید الرحمن کی آلہ کار بن گئی تھی۔“

”مس سیما اب کیسی ہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”چلو بھی“ اس کو تو پڑ گئی اپنی موکلہ کی۔ ”عمر دراز نے ایک گونج دار قہقہے کے ساتھ کہا ”اور جب موکلہ اتنی دولت مند اور خوب صورت ہو تو کون بے وقوف اس کی پروا نہیں کرے گا۔“

”سیما کی حالت بہتر ہے“ ڈاکٹر پُر امید ہیں کہ وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائے گی اور مسٹر عمر دراز آپ مجھے نہیں بھکا سکتے۔“

”کس سلسلے میں؟“ عمر دراز نے مصیبت سے سوال کیا۔

”اس سلسلے میں۔۔۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا پھر اچانک ہی شاید اسے احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہے لہذا بوکھلا کر خاموش ہو گئی۔ مگر کرا میرے اور عمر دراز کے مشترکہ قہقہے سے گونج اٹھا۔

آگئی تھی۔ وہ ناراضگی سے بولی۔

”میں اتنا تر نوالہ نہیں تھی کہ وہ مجھے آسانی سے ہڑپ کر جاتا۔“ میں نے اور عمر دراز نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔

”اب تم باقی اسٹوری مجھ سے سنو“ عمر دراز ہنستے ہوئے بولا

”حمید نے بظاہر سیما کو اغوا کروایا اور خود شک سے بری الذمہ ہونے کے لیے اپنے بیٹے کو بھی غائب کر دیا۔ پھر یہ تاثر دیا کہ اغوا کرنے والوں نے اس سے تاوان مانگا ہے اور پولیس سے رابطہ نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ بظاہر اس نے بدحواسی میں مجھے یعنی پولیس کو انفارم کر دیا۔ یوں اس نے ”اغوا کنندگان“ کی ہدایت کی کھلی خلاف ورزی کر دی۔ مگر احتیاطاً اس نے ہمیں صرف تاوان دگنا ہونے کی خبر سنائی۔ اس کا مقصد تھا کہ ہم پروا صبح ہو جائے کہ مجرم بہت باخبر ہیں۔ اس کے منصوبے کا اصل حصہ کچھ یوں تھا کہ واحد موقع پاکر اغوا کنندگان کی قید سے ”فرار“ ہو جائے گا۔ اس پر مشتعل ہو کر وہ مس سیما کو مار ڈالیں گے۔ یوں حمید الرحمن کا راستہ صاف ہو جاتا اور اس پر کوئی الزام بھی نہیں آتا مگر ان کی بد قسمتی کہ میں ان کی تاک میں تھا۔“

”ظاہر ہے یہ واقعی بہت بڑی بد قسمتی تھی“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھور کر رہ گیا مگر اپنی بات جاری رکھی۔

”میں وحید پلس کے تمام ٹیلی فون ٹیپ کر رہا تھا۔ حمید الرحمن کی سازش کا پول تو یونہی کھل گیا تھا کہ اس کے پاس کوئی کال نہیں آئی تھی۔ وہ شخص ڈراما کر رہا تھا۔“

”یعنی تم شروع سے مشکوک تھے؟“ میں نے کہا۔

”صرف شک نہیں مجھے پورا یقین تھا مگر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔“

”محض ثبوت کے لیے تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑا؟“

”بالکل ورنہ میں جب چاہتا انہیں گرفتار کر سکتا تھا۔“

”یہ توخیر ہماری پولیس کی عادت ہے“ میں نے کہا اور اس نے مجھے پھر گھورا۔ ”خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ ان خاتون کا کردار اس میں کہاں سے شامل ہوتا ہے اور ان کا اصل نام کیا ہے۔“

”یہ تو خود ہی بتائیں گی کہ ان کا کردار کہاں سے شروع ہوتا ہے مگر میں اتنا بتا دوں کہ اگر یہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہماری مدد نہ کرتیں تو ہم حمید الرحمن اینڈ کمپنی کو اتنی آسانی سے گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔“

”چلو تم ہی بتاؤ۔“ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بنا سستی سیما سے کہا۔

”میرا نام دلکش ہے“ وہ مسکرا کر بولی ”اور اس کمانی میں میرا کردار خاصا پُرانا ہے۔ سیما اسکول کے زمانے سے میری سہیلی تھی۔ ہم نے ساتھ ہی ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ پینتنگ بھی ہم دونوں کا مشترکہ شوق تھا۔ جب وہ اچانک بغیر اطلاع دیے غائب